

وجی اور نبوت

آیة اللہ شہید مرتضیٰ مطہری (رَحْمَةُ اللّٰہِ عَلٰیہِ)



jabir.abbas@yahoo.com



شہید مطہری فاؤنڈیشن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرض ناشر

”شہید مطہری فاؤنڈیشن“ دینی مواد کی اشاعت کے سلسلہ میں نیا ادارہ تشكیل دیا گیا ہے۔ ادارے کا مطبع نظر عوام کو بہتر اور سستے ترین انداز میں دینی مواد بذریعہ کتب اور ائمۃ نیت فراہم کرنے کا پروگرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ادارہ ہذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیر نظر کتاب ”وچی اور نبوت“ شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کی سعی بھیل کا نتیجہ ہے ہماری دنیا ایک بامقصد دنیا ہے یعنی اس کائنات کے تمام موجودات کے اندر اپنے ہدف کمال کی طرف بڑھنے کی کشش موجود ہے اور با مقصد ہونے سے مراد ”ہدایت الہی“ ہی ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ”وچی“ کا متعدد بار ذکر ہوا ہے۔ قرآن اس لفظ کو صرف انسان کے لئے محدود نہیں کرتا بلکہ تمام اشیاء اور کم از کم زندہ موجودات میں اسے جاری و ساری سمجھتا ہے۔ اس کتاب میں انہیں آخذ پر بحث کی گئی ہے۔ قارئین حضرات اس سے استفادہ کریں۔ خداوند عالم ادارہ ہذا کی اس سعی کو قبول فرمائے۔

ادارہ ہذا نے اس کتاب کے موضوعات کو مختلف ایرانی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔ کتاب کو پاکستان کی عوام کے پسندیدہ خط، فونٹ اور انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نیت پر آپ لوڈ کرنے والوں کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے۔ امید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ والسلام

شہید مطہری فاؤنڈیشن

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب	وچی اور نبوت
مصنف	شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ
سینگ	قلب علی سیال
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اول
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراجِ کمپنی

LG-3 پیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

41	دین یا ادیان؟
44	ختم نبوت
45	نبیوں کی تجدید کے اسباب
48	ا۔ وجی
62	مجزہ ختمی مرتبہ
71	غیر قرآنی مجزہ
78	مجزہ کی قدر و قیمت اور افادیت
78	مجزوں کی اہمیت و افادیت قرآن کی نظر میں
79	پیغمبر کی ہدایت کا رخ
85	قرآن
86	قرآن کیلئے مسلمانوں کی عظیم کوشش
87	اعجاز قرآن
88	قرآن کے مجذہ پہلو
88	الافتاظ قرآن
93	معانی قرآن
96	قرآنی موضوعات
99	معانی قرآن کی وسعت
100	اللہ اور قرآن
102	انسان کا خدا سے رشتہ و تعلق
103	قرآن، تورات اور انجیل
103	تاریخی واقعات اور قصے

فہرست مضمایں

9	عمومی ہدایت
12	انبیاء کی خصوصیات
12	۱۔ اعجاز
13	۲۔ عصت
14	گناہ سے محفوظ رہنا
15	۱۔ خطا اور غلطی سے محفوظ رہنا
16	۲۔ پیغمبروں اور نابغہ افراد کے درمیان فرق
17	۳۔ قیادت و رہبری
18	۴۔ خلوص نیت
21	۵۔ اصلاح احوال
21	۶۔ مقابلہ اور جہاد
22	۷۔ بشری پہلو
23	۸۔ صاحبان شریعت پیغمبر
25	انبیاء کا تاریخی کردار
30	۱۔ تعلیم و تربیت
30	۲۔ عہدوں پر زندگی استوار کرنا
31	۳۔ اجتماعی قید و بند کی آزادی
34	مقصد بعثت انبیاء

7	وچی اور نبوت	6	وچی اور نبوت
132	۱۶۔ کام اور مشغله:	104	قرآن اور اس کی پیشین گویاں
132	۱۷۔ پیشے اور فن و ہنر کا مقدس ہونا:	105	اسلام کی امتیازی خصوصیات
133	۱۸۔ استھان کی ممانعت:	111	(الف) معرفت اور شناخت کا مسئلہ ۱۔
133	۱۹۔ اسراف و فضول خرچی:	116	شناخت کے موضوعات:
134	۲۰۔ زندگی میں ترقی و توسعہ:	116	(ب) تصور کائنات کے لحاظ سے
134	۲۱۔ رشوت:	126	(ج) آئینہ یا لوچی کے لحاظ سے اسلام کی خصوصیات
134	۲۲۔ ذخیرہ اندوزی:	126	۱۔ کمال و ارتقاء
134	۲۳۔ آمدنی کا مصلحت کی بیان پر ہونا نہ کہ طلب و تقاضے کی بیان پر ۱۳۴	127	۲۔ اجتہاد قبول کرنے کی صلاحیت:
137	۲۴۔ حقوق کا دفاع	127	۳۔ سہولت اور آسانی:
137	۲۵۔ اصلاح	127	۴۔ زندگی کی طرف میلان و رغبت:
138	۲۶۔ توحید:	128	۵۔ اجتماعی ہونا:
140	۲۷۔ واسطوں کی نفی:	128	۶۔ انفرادی حقوق اور آزادی:
140	۲۸۔ اہل توحید کے ساتھ باہمی زندگی کا امکان:	129	۷۔ معاشرتی اور اجتماعی حق کی انفرادی حق پر فویت:
141	۲۹۔ مساوات:	129	۸۔ شوریٰ کا حصول:
143	پنجبر اسلام مصلحتی ایڈیشن	130	۹۔ مضر حکم کا نہ ہونا:
144	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا دور	130	۱۰۔ مفید نتیجہ اور فائدے کی امتیازی حیثیت:
145	کاملی اور بے کاری سے نفرت	130	۱۱۔ لین دین میں خیر و صلاح کا لحاظ:
145	امانت	131	۱۲۔ عقیم
146	ظلہ سے مقابلہ	131	۱۳۔ واقفیت و آگاہی
146	گھر لیوا خلاق	131	۱۴۔ خلاف عقل امور سے مقابلہ:
147	غلاموں کے ساتھ آپ کا سلوک	132	۱۵۔ خلاف ارادہ امور سے مقابلہ:

148	صفائی پاکیزگی اور خوشبو
148	ملاقات اور معاشرت
149	مزاج میں زمی بھی سختی بھی
151	عبدات
152	زہد اور سادہ زندگی
152	ارادہ اور پامردی
153	قیادت
154	نظم و ضبط
155	تلقید سنن کی طاقت اور مذاہی و چاپلوسی سے نفرت
156	لوگوں کی کمزوری و نوااقفیت سے غلط فائدہ نہ اٹھانا
157	رسول اکرمؐ کی شخصیت قیادت و رہبری کی شرائط کی بہترین مصدق
158	تلہجہ کا طریقہ کار
159	علم کی تشویق و ترغیب

طرف کچھی چلی جا رہی ہیں۔ یہ وہی قوت ہے، جسے ”اللہ ہدایت“ سے تعمیر کیا جاتا ہے، قرآن کریم حضرت موسیٰ کا قول نقل کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے فرعون سے کہا تھا:

رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَةً ثُمَّ هَدَى (طه ۵۰)

”میرا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو ویسا وجود بخشنا جو اس کے لائق تھا اور پھر اس وجود کو اس کی راہ پر چلنے کی ہدایت کی۔“

ہماری دنیا ایک مقصد دنیا ہے یعنی اس کا نبات کے تمام موجودات کے اندر اپنے بدف کمال کی طرف بڑھنے کی کشش موجود ہے اور با مقصد ہونے سے مراد ہدایت ”اللہ“ ہی ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ”وہی“ کا متعدد بار ذکر ہوا ہے۔ اس لفظ کے استعمال کی شکل اور اس کے استعمال کے مختلف مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن اس لفظ کو صرف انسان کے لئے محدود نہیں کرتا بلکہ تمام اشیاء اور کم از کم زندہ موجودات میں اسے جاری و ساری تھتا ہے۔ اسی لئے شہد کی کمی کے بارے میں بھی وہی کے لفظ کا استعمال کیا ہے البته وہی وہدایت کے درجات مخلوقات کی ترقی و کمال کے اعتبار سے جدا ہیں۔

وہی کا بلند ترین درجہ وہی ہے جو پیغمبروں سے مربوط ہوتا ہے۔ یہ وہی اس ضرورت کی بنیاد پر ہوتی ہے جس کے لئے نوع انسانی ہدایت ”اللہ“ کی محتاج ہوتی ہے جو ایک طرف تو انسان کو ایسے مقصد کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو محسوسات و مادیات کے افق سے ماوراء ہے اور بہر حال انسان کے لئے ایک گزرگاہ ہوتی ہے اور دوسری طرف اجتماعی زندگی میں بشر کی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے جس کے تحت وہ ہمیشہ ایسے قانون کا محتاج ہوتا ہے جو ”اللہ“ صفات کا حامل ہو اس سے قبل ہم ”مکتب“ اور ”آئینہ یا لوگی“ کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ انسان کو ایک کمال آفرین آئینہ یا لوگی کی ضرورت

عمومی ہدایت

وہی وہ نبوت پر اعتماد دنیا اور انسان کے بارے میں ایک طرح کی بصیرت و آگاہی سے پیدا ہوتا ہے یعنی تمام مخلوقات کے لئے ہدایت و رہنمائی کے اصول کی معرفت سے عمومی ہدایت کا اصول اسلامی اور توحیدی تصور کا نبات کا لازمہ ہے اسی لئے نبوت پر اعتماد اس تصور کا نبات کا لازمہ ہے۔ خدا تعالیٰ اس اعتبار سے کہ واجب الوجود بالذات ہے اور واجب الوجود بالذات تمام جہتوں سے واجب ہے وہ فیاض علی الاطلاق ہے اور انواع موجودات میں سے ہر نوع کو جس حد تک وہ لیاقت رکھتی ہے اور اس کے لئے ممکن ہے اپنے فعل و کرم سے نوازتا ہے اور تمام موجودات کو ان کی راہ پر ہدایت کرتا ہے۔ یہ ہدایت تمام موجودات پر محیط ہے۔ چاہے کوئی وجود معمولی ترین اور چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہو یا بڑے سے بڑا ستارہ اور ایک نہایت معمولی ترین بے جان وجود سے لے کر اعلیٰ ترین اور ترقی یافتہ جاندار تک جسے ہم پہچانتے ہیں یعنی انسان، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس طرح انسانوں کی ہدایت کے لئے لفظ وہی استعمال کیا ہے، اسی طرح جمادات، نباتات اور حیوانات کی ہدایت کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔

اس دنیا میں کوئی بھی وجود ایک جیسا اور ثابت و قائم نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ اپنی منزل اور مقام کو بدلتا رہتا ہے اور ایک مقصد کی طرف روای دوال ہے۔ دوسری طرف تمام قرآن و علامات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر وجود میں جس طرف وہ بڑھ رہا ہے اس منزل کی طرف بڑھنے کا رجحان اور میلان اس میں پایا جاتا ہے، یعنی تمام موجودات اپنی ذات میں موجود پوشیدہ قوتوں کے ذریعے اپنے مقصد کی

انبیاء کی خصوصیات

انبیاء الہی جو جو کے ذریعے مبداء اور سرچشمہ ہستی سے رابطہ برقرار کرتے ہیں ان کے کچھ امتیازات اور اوصاف ہوتے ہیں جن کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اعجاز

جو پیغمبر بھی اللہ کی جانب سے مبعوث ہوتا ہے وہ غیر معمولی قوت کا حامل ہوتا ہے اسی غیر معمولی قوت و طاقت کے ذریعے وہ ایک یا کئی ایسے کام انجام دیتا ہے جو انسانی طاقت سے بالاتر ہوتے ہیں اور اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان امور کو انجام دینے والا غیر معمولی الہی طاقت کا حامل ہے یہ بات اس کی دعوت کے برق ہونے اور اس کی باتوں کے آسمانی ہونے کی دلیل بھی ہے۔

قرآن کریم ان غیر معمولی امور کے آثار کو کہ جنہیں پیغمبروں نے اپنے دعوے کی سچائی پر گواہی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ”آیت“ یعنی نبوت کی علامت اور نشانی کہتا ہے۔ مسلمان متكلّمین اس اعتبار سے کہ ایسی علامت دوسرے تمام افراد کی عجز و ناتوانی کو ظاہر کرتی ہے، اسے مجذہ کہتے ہیں۔ قرآن مجید نقل کرتا ہے کہ ہر زمانے کے لوگوں نے اپنے دور کے انبیاء سے ”آیت“ اور مجذہ کے تقاضا کیا ہے اور ان پیغمبروں نے اس تقاضے اور مطالبے کا جو منطقی اور معقول بھی تھا، اس لئے ثابت جواب دیا کہ یہ حقیقت کی تلاش کرنے والے لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا اور ان لوگوں کے لئے مجذہ کے بغیر پیغمبر کو پہچاننے کا کوئی دوسرا استہبھی نہیں تھا۔ لیکن اگر مجذہ کا تقاضا حقیقت کی تلاش کے بجائے کسی اور مقصد سے ہوتا مثلاً کسی معاملے کی صورت میں

ہے لیکن وہ خود اس کی تدوین و تنظیم کی قوت نہیں رکھتا، انبیاء بشریت کے لئے ایک ریسیور کی مانند عالم غیب سے اس قسم کا علم آگئی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس صلاحیت سے خدا کے سوا کوئی واقف نہیں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (سورہ انعام، آیت ۱۲۷)

ہر چند وحی انسانوں کے حس و تجربہ کی پیش سے بالاتر ہے لیکن اس قوت کو دوسری بہت سی قتوں کی مانند اس کے آثار کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔ وچی الہی، حامل وچی یعنی پیغمبر کی شخصیت میں بہت حیرت انگیز طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے۔ وچی حقیقت میں اسے ”بعوث“ کر دیتی ہے یعنی اس کی قتوں کو ابھارتی ہے اور اس میں نہیات عظیم و عمیق انقلاب وجود میں لے آتی ہے، یہ انقلاب بشریت کی بھلائی، رشد و ہدایت اور اصلاح و درستی کی سمت میں نمودار ہوتا رہا ہے، حقیقت پسندی کے ساتھ عمل کرتا ہے اور پیغمبر میں ایک بے نظیر و بے مثل قاطعیت کا عنصر پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ نے آج تک انبیاء اور ان کے تربیت یافتہ افراد کے طبقیان و تلقین جیسا اطمینان و تلقین کسی اور میں پیش نہیں کیا۔

گناہ سے محفوظ رہنا

انسان ایک باختیار موجود ہے اور اپنے کاموں کو اپنے فائدوں اور نقصانات، مصلحتوں اور خرابیوں کی تشخیص کی بنیاد پر انجام دیتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ”تشخیص“ کاموں کے اختیار و انتخاب میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ امر محال ہے کہ انسان کسی ایسے کام کا اپنے لئے انتخاب کرے، جس میں اس کی اپنی تشخیص کے مطابق ایک طرف تو کسی قسم کا فائدہ نہیں ہے وہ سری طرف اس میں نقصان ہی نقصان ہے مثلاً ایک عقلمند انسان جسے اپنی زندگی سے محبت ہو کبھی جان بوجھ کر اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے نہیں گرانے گا یا مہلک زہ نہیں کھائے گا۔

لوگ اپنے ایمان اور گناہوں کی اجرت و متناج پر توجہ رکھنے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا ایمان جتنا زیادہ قوی ہوگا اور گناہوں کے خطرناک متناج کی طرف توجہ جتنی شدید ہوگی، گناہوں سے وہ اتنا ہی دور ہیں گے اور کم ہی گناہ کا ارتکاب کریں گے۔ پس اگر درجہ ایمان شہود و عیاں کے درجے تک پہنچ جائے یعنی اس حد تک کہ آدمی گناہ کرنے کا ارادہ کرتے وقت اپنے آپ کو اس شخص کی مانند سمجھے جو دیدہ دانستہ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا رہا ہے یا مہلک زہر پی رہا ہے، تو ایسی صورت میں ارتکاب گناہ کا امکان صفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے یعنی وہ ہرگز گناہ کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ اسی ہی حالت کو ہم عصمت یعنی گناہوں سے محفوظ رہنا کہتے ہیں۔ پس گناہ سے محفوظ رہنے کا تعلق کمال ایمان اور شدت تقویٰ سے ہے۔ لہذا انسان کو درجہ عصمت پر فائز ہونے کے لئے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک خارجی اور غیری قوت جو اسے گناہ سے باز رکھے یا معموم شخص اپنی سرشت و خلقت کی بنیاد پر ایسا ہو کہ اس سے گناہ کی

لوگوں کی طرف سے یہ خواہش کی جاتی، اگر آپ فلاں کام انجام دیں گے تو ہم اس کے بد لے میں آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے تو انہیاے الہی اس کام کو انجام دینے سے انکار کر دیتے۔ قرآن کریم نے انہیاء کے بہت سے مجرمات کو بیان کیا ہے مثلاً مردے کو زندہ کرنا، لاعلان یا پارکو شفاذینا، گھوارے میں با تین کرنا، عصا کو واژدھے میں تبدیل کرنا اور غیب و آئندہ کی خبر دینا۔

۲ عصمت

انہیاء کی خصوصیات میں سے ایک عصمت ہے۔ عصمت یعنی گناہ و خطا سے محفوظ یعنی انہیاء کرام نہ تو نفسانی خواہشات کے زیر اثر آتے ہیں جس کی وجہ سے گناہ کے مرتكب ہوتے ہوں اور نہ ہی اپنے کاموں اور فرائض کی ادائیگی میں خطاو غلطی سے دوچار ہوتے ہیں۔ انہیاء کی گناہ و خطا سے دوری انہیں انتہائی اعتماد کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گناہوں سے ان کی معصومیت کس نوعیت کی ہے؟ مثلاً کیا ان کی عصمت کا یہ معنی ہے کہ جب بھی وہ چاہیں کسی گناہ کے مرتكب ہوں تو ایک غیبی طاقت ان کے سامنے آ جاتی ہے انہیں وہ اس شفیق باپ کی مانند جو اپنے فرزند کو خطا و غلطی نہیں کرنے دیتا، گناہ کرنے سے روک دیتی ہے؟ یا یہ کہ انہیاء کی طبیعت و خلقت اس طرح کی ہوتی ہے کہ نہ تو ان میں گناہ کا امکان ہے اور نہ ہی خطا اور غلطی کا بالکل اسی طرح جیسے ایک فرشتہ اس دلیل کی بناء پر غلطی نہیں کرتا کہ وہ ذہن سے عاری ہے یا یہ کہ پیغمبروں کے گناہ نہ کرنے کی وجہ ان میں پائی جانے والی بصیرت اور ایک طرح کا درجہ یقین و ایمان ہے۔ بے شک ان تمام صورتوں میں یہی تیسری صورت صحیح ہے۔ اب ہم ان دونوں قسم کی معصومیت کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں:

دھرا یا ہے یا ایک سو ایک مرتبہ ایسا کیا ہے لیکن اصل حقیقت میں کمی یا زیادتی کا ہونا محال ہے۔

اگرچہ اس عمل کو ۱۰۰ مرتبہ دھرا یا گیا ہے لیکن دونوں کی مجموعی تعداد میں کمی یا بیشی واقع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جو لوگ اپنی آگاہی و بصیرت کی بناء پر اصل حقیقت کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں یا ہستی وجود اور اس کے ساتھ متعدد متصل ہو جاتے ہیں تو ان کے یہاں اشتباہ و خطا کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور وہ ہرگز گناہ سے معصوم اور محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ پیغمبروں اور نابغہ افراد کے درمیان فرق

یہیں سے اس فرق کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے جو انبیاء اور نابغہ روزگار شخصیات کے درمیان ہوتا ہے۔ نابغہ شخصیات وہ ہوتی ہیں جن میں قوت عقل و فکر اور حساب کرنے کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے یعنی وہ اپنے حواس کے ذریعے اشیاء سے رابطہ پیدا کرتے ہیں اپنی تیز عقل کی بناء پر اپنی ذہنی معلومات پر کام کرتے ہیں اور نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں مگر اتفاق سے کبھی غلطی بھی کر جاتے ہیں۔

انبیاء الہی عقل و خرد اور ذہنی حساب کتاب کی قوت کے حامل ہونے کے علاوہ ایک اور قوت سے بھی بہرمند ہوتے ہیں جسے وہی کہا جاتا ہے جب کہ نابغہ شخصیات اس قوت سے بہرہ مند نہیں ہوتیں، اسی لئے انبیاء سے ان کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ موازنہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب دونوں کے کام ایک ہی نوع اور ایک طرح کے ہوں لیکن جب دونوں کے کام مختلف نوعیت کے ہوں تو ایک کا دوسرا پر قیاس غلط ہوگا۔ مثلاً دو افراد کی قوت پینائی، سماعت یا فکر کا آپس میں موازنہ کیا جائے لیکن یہ ہرگز صحیح نہیں ہوگا کہ ایک شخص کی قوت پینائی کا دوسرا شخص کی قوت سماعت

قوت یا خواہش ہی چھین لی گئی ہو۔ اگر کوئی انسان گناہ پر قادر ہی نہ ہو یا ایک جبری قوت اسے ہمیشہ گناہ کرنے سے باز رکھتی ہو تو اس کے لئے گناہ نہ کرنا کوئی کمال کی بات نہیں ہو گی، کیوں کہ ایسی صورت میں وہ ایک ایسے انسان کی مانند ہوگا جو کسی قید خانے میں بند ہوا اور خلاف قانون کام کرنے پر قادر ہی نہیں ہے ایسے انسان کا نافرمانی نہ کرنا اس کے نیک کردار اور امین ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

۱۔ خطاء اور غلطی سے محفوظ رہنا

خطا سے پاک ہونا بھی انبیاء کی ایک طرح کی بصیرت و آگاہی کا تجوہ ہے۔ خطاء ہمیشہ اس صورت میں سرزد ہوتی ہے جب انسان اپنی اندر وہی یا یہ وہی حس کے ذریعے کسی حقیقی شے سے ارتباط برقرار کرتا ہے اور اپنے ذہن میں اس حقیقت کی مختلف صورتیں بنالینے کے بعد اپنی عقلی قوت کے ذریعے ان صورتوں کا تجزیہ کرتا ہے یا آپس میں انہیں ترتیب دیتا ہے اور ان میں انواع و اقسام کے تصرفات کرتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی ذہنی صورتوں کو خارجی حقائق پر منتبط کرتا ہے اور انہیں ترتیب دیتا ہے تو اس وقت کبھی کبھی غلطی یا خطاء سرزد ہوتی ہے لیکن جہاں انسان براہ راست عین حقائق کے ساتھ ایک خاص حس کے ذریعے رابطہ برقرار کر لے اور ادراک حقیقت بعینہ واقعیت و حقیقت سے متصل ہونا ہونہ کہ ذہنی صورت حقیقت و واقعیت سے متصل ہو تو ایسی صورت میں خطاء یا غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انبیاء الہی بھی باطنی طور پر حقیقت ہستی سے رابطہ رکھتے ہیں الہذا حقیقت و واقعیت کے ادراک میں ان سے غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگر ہم تبعیج کے سودا نوں کو کسی برلن میں ڈال دیں اور پھر دوسرے سودا نے بھی اسی برلن میں ڈال دیں اور سوم مرتبہ اس عمل کو دھرا نہیں تو ممکن ہے ہمارا ذہن خطاء سے دوچار ہو جائے اور ہم یہ خیال کرنے لگیں کہ ہم نے یہ عمل ۹۹ مرتبہ

”باطنی انسان اس سکون و اطمینان کے حاصل ہو جانے کے بعد جسے وہ اپنے معنوی اور باطنی سفر میں حاصل کرتا ہے، نہیں چاہتا کہ وہ پھر اس دنیوی زندگی کی طرف واپس آئے، لیکن ایسے وقت جب کہ وہ شدید ضرورت کی بناء پر اس دنیوی زندگی میں واپس آبھی جاتا ہے، تو اس کی یہ واپسی انسانی معاشرے کے لئے کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوتی، لیکن نبی کی دنیوی زندگی کی طرف واپسی خلا قیمت کا پہلو رکھتی ہے اور تیجہ خیز ہوتی ہے۔ نبی اس دنیا میں واپس آتا ہے اور زمانے کے دھارے میں اس ارادے سے وارد ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کے بھاؤ کو اپنے اختیار میں لے اور اس طریقے سے مطلوبہ کمالات کی ایک نئی دنیا خلق کرے۔ باطنی انسان کے لئے سکون حاصل ہو جانا ہی انتہائی اور آخری منزل ہے، لیکن پیغمبر کے لئے اس کی روح شناسی کی قوت کا بیدار ہونا (آخری منزل ہے) جس کے ذریعے وہ دنیا کو ہلا دیتا ہے اور یہ طاقت ایسی ہوتی ہے، جو بشری دنیا کو بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے۔“ (احیاء فکر دینی دراسلام، ترجمہ: احمد آرام، ص ۱۳۳)

اس بناء پر خلق خدا کی قیادت و رہبری اور رضائے الہی اور فلاح بشریت، انسانی قوتوں کو حركت میں لانا اور منظم کرنا پیغمبری کا ایسا جزو لازم ہے جسے اس سے ہرگز جدا نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ خلوص نیت

انبیاءے الہی چونکہ خدا پر مکمل اعتقاد رکھتے ہیں اور ہرگز اس بات کو فرماؤش نہیں کرتے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے اور وہ اسی فریضے کو ادا کر رہے ہیں لہذا اپنے اس فریضے کی ادا یگل میں نہایت خلوص سے کام لیتے ہیں، یعنی ہدایت بشر کے سوا کہ جو تقاضائے الہی بھی ہے، کوئی اور ہدف و مقصد نہیں رکھتے اور نہ ہی لوگوں سے انجام رسالت کا ”اجر“ مانگتے ہیں۔

سے موازنہ کریں اور یہ کہیں کہ فلاں زیادہ طاقت و قوت کا حامل ہے۔ نابغہ شخصیات کا نبوغ انسانی عقل و فکر کی قوت سے مربوط ہے جب کہ پیغمبروں کی غیر معمولی شخصیت ایک اور قوت کے ساتھ مربوط ہے جسے وچی اور مبداءے ہستی سے اتصال کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا غلط ہو گا۔

۳۔ قیادت و رہبری

رسالت و پیغمبری کا آغاز اگرچہ اللہ کی طرف معنویت کے سفر، اس کی ذات سے قربت حاصل کرنے اور مخلوق سے قطع تعلق (سیر من الخلق الی الحق) سے ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ ظاہر سے رو گردانی اور اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہونا ہے، لیکن اس کا انعام انسانی زندگی کی اصلاح کرنے اور اسے منظم رکھنے اور ایک صحیح راستے کی طرف اس کی ہدایت (سیر بالحق فی الْخُلُق) کی غرض سے خلق اور ظاہر کی طرف واپسی ہوتا ہے۔

”نبی“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ”خبر لانے والا“ فارسی میں لفظ پیغمبر اسی معنی کو داکرتا ہے اور ”رسول“ عربی زبان میں ”بھیجا گیا“ کے معنی میں ہوتا ہے اور انہیں بروئے کا رلاتا ہے وہ خدا کی طرف اور ان امور کی طرف جو خداوند عالم کی خوشنودی کا باعث ہیں مثلاً صلح و صفا، اصلاح پسندی، بے ضرری، غیر خدا سے آزادی، سچائی، شاشٹگی، محبت و عدالت اور دیگر اخلاق حسنہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے وہ بشریت کو ہوا نے نفس اور طرح طرح کے بتوں اور طاغوتوں سے نجات دلاتا ہے۔

علامہ اقبال نے انبیاء اور ایسے افراد کے درمیان جو اللہ کی طرف معنویت کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں، لیکن انہیں پیغمبری کا منصب نہیں دیا گیا اور اقبال انہیں ”باطنی انسان“ کا نام دیتے ہوئے فرق کو یوں بیان کرتے ہیں:

نبی اکرم نے بعثت کے ابتدائی برسوں میں جب کہ مسلمانوں کی کل تعداد شاید دونوں ہاتھوں کی الگیوں کے برابر بھی نہیں ہو گئی، ایک نشست میں جسے تاریخ نے ”یوم الانزار“ کے نام سے محفوظ رکھا ہے، بزرگان بنی ہاشم کو جمع کیا اور اپنا الہی پیغام ان تک پہنچایا اور نہایت صریح و قطعی انداز میں انہیں اس بات کی خبر سنائی کہ میراد دین عالم گیر حیثیت اختیار کر جائے گا اور تمہاری فلاح و سعادت اسی میں ہے کہ میری پیروی کرو اور میری دعوت قبول کرو، انہیں نبی اکرم کی یہ بات اتنی گراں اور ناقابل یقین لگی کہ سب نے تجہب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جواب دیئے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

جب نبی اکرم کے چچا جناب ابوطالب نے قریش کا یہ پیغام سنایا کہ ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ انہیں (پیغمبر) اپنا بادشاہ مان لیں، قوم کی حسین ترین لڑکی، ان کی زوجیت میں دے دیں اور انہیں اپنی قوم کا دولت مند ترین شخص بنادیں، بشرطیکہ وہ جو کام کر رہے ہیں اور جو باقی تک کہہ رہے ہیں ان سے بازاً جائیں، تو انہوں نے یہ پیغام آنحضرت تک پہنچایا۔ اس پر آنحضرت نے جواب میں فرمایا:

”خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے ہاتھ پر ماہتاب لا کر رکھ دیں، میں تب بھی اللہ کی طرف انہیں بلانے سے باز نہیں آؤں گا اور پیغام الہی کی تبلیغ سے دست بردار نہیں ہوں گا۔“

جی ہاں! جس طرح انسانوں کی قیادت کے لئے خطاؤ گناہ سے محفوظ قوت وہی اور اللہ سے اتصال اپنا ضروری ہے اور خطاؤ گناہ سے محفوظ رہنے کے لئے وہی کی قوت اور اللہ سے رابطہ اور اتصال کی ضرورت ہے، اسی طرح خلوص اور یقین و اطمینان پیغمبر کی ذات کا لازمی جزو ہے۔

قرآن کریم نے سورہ اشتراء میں بہت سے انبیاء کے اتوال کو جو انہوں نے اپنی اپنی قوتوں کے سامنے پیش کئے بطور خلاصہ نقل کیا ہے۔ البتہ ہر نبی نے اپنے راستے میں آنے والی مشکل یا مشکلات کی ممتازی سے اپنی قوم کو ایک طرح کا پیغام دیا ہے، لیکن ایک چیز جس کا تمام پیغمبروں کے پیغام میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ میں ”تبلیغ رسالت پر تم سے کسی اجرت اور مزدوری کا طلب گار نہیں ہوں“ لہذا خلوص اور خلق سے بے نیازی بھی پیغمبری کے امتیازات میں سے ہے اور اسی لئے انبیاء کا پیغام ہمیشہ ایک بے نظیر یقین و اطمینان کے ہمراہ رہا ہے۔

انبیاء چونکہ اپنے تینیں ”مبعوث“ سمجھتے ہیں اور اپنی رسالت، اس کی ضرورت اور اس کے شر بخش ہونے پر معمولی سا بھی شک نہیں کرتے، لہذا اپنے پیغام کی اس یقین و اطمینان کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں، ایسا دفاع کرتے ہیں کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

حضرت موسیٰ بن عمران اپنے بھائی ہارون کے ہمراہ ادنیٰ لباس زیب تن کئے ہوئے اور ہاتھوں میں عصا لئے ہوئے اپنی اسی ظاہری حالت کے ساتھ فرعون کے پاس جاتے ہیں اور اسے توحید کی طرف دعوت دیتے ہیں اور پورے یقین و اطمینان کے ساتھ فرماتے ہیں:

”اگر تو نے ہماری دعوت کو قبول نہ کیا تو تیری حکومت کا زوال یقینی ہے اور اگر تو نے دعوت کو قبول کر لیا اور ہمارے راستے پر چلنا شروع کر دیا تو ہم تیری عزت و آبرو کے ضامن بن جائیں گے۔“

فرعون نے بڑے تجہب کے ساتھ کہا:

”ذر ا ان لوگوں کو دیکھو یہ اپنی پیروی کی صورت میں میری عزت کی ضمانت دے رہے ہیں وگرنہ میری حکومت کے زوال پذیر ہونے کی بات کرتے ہیں۔“ (نحو الملاعنة، خطبہ ۱۹۰)

آتی ہو یا وہ کسی ظالم و ستم گر کی مدد و دوڑ پڑے اور بد عنوانی و بے انسانی کی تائید کرے یا شرک، جہالت، خرافات و لغویات اور ظالموں کے ظلم و جور کے زیر خاموشی اختیار کرے اور ان سے جنگ و جدال اور جہاد کے لئے اٹھ کھڑا نہ ہو۔ تو حید، عقل اور عدالت تمام انبیاء کے اصولوں میں سے ہے اور صرف ایسے ہی افراد کی دعوت قابل مطالعہ اور دلیل و مجزہ طلب کرنے کے لائق ہے، جو اس راستے پر چلتے ہوئے دعوت دیتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص اپنے پیغام میں کوئی ایسی چیز پیش کرے جو تو حید کے خلاف ہو یا اس حکم کے خلاف ہو جو تمام عقولوں کے نزدیک قطعی اور مسلم ہو یا عدل کے خلاف ظلم کی تائید میں ہو تو ایسے شخص کا پیغام نہ تو مطالعے کے لائق ہے اور نہ ہی دلیل کے مطلبے کے قابل ہے۔ اسی طرح اگر ایک مدعی نبوت گناہ یا خطلا کا مرتكب ہوتا ہے یا خلق خدا کی قیادت و رہبری کی طاقت نہ رکھتا ہو، اگرچہ اس ناتوانی کا سبب کوئی جسمانی عیوب یا جذاب جیسی نفرت ایگزی بیماری ہو یا اس کی دعوت حیات انسانی کے راستے پر نہ ہو تو اس کا پیغام دلیل و مجزہ کے مطلبے کے لائق نہیں ہے۔ بہر حال ایسے افراد اگر (بفرض حال) مجرمہ گر بھی ہوں اور بہت سے مجرموں بھی دکھلادیں تب بھی عقل ان کی پیروی کو جائز قرار نہیں دیتی۔

۷۔ بشری پہلو

انبیاء اپنے تمام غیر معمولی پہلوؤں مثلاً مجذہ، گناہ و خطلا سے محفوظ رہنا، بے مثال قیادت و رہبری اور بے مثال تعمیری کردار نیز شرک، خرافات اور ظلم و ستم کے خلاف قیام کے باوجود نوع بشر سے تعلق رکھتے ہیں یعنی انبیاء تمام لوازمات بشر کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسروں کی طرح کھاتے ہیں، سوتے ہیں، چلتے ہیں، اولاد پیدا کرتے ہیں اور بالآخر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، وہ تمام ضروریات جو بشریت کا

۵۔ اصلاح احوال

انبیاء کرام جو انسانی قوتوں کو حرکت میں لاتے ہیں اور منظم کرتے ہیں، ان کا یہ کام صرف فرد اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر کی خاطر ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں ان کا یہ سارا عمل بشری سعادت کے لئے ہوتا ہے اور مجال ہے کہ ان کا یہ سارا عمل فرد کو فاسد اور خراب کرنے اور معاشرے کو تباہ کرنے کے لئے ہو۔ اس بناء پر اگر نبوت کے مدعی کی دعوت کا اثر انسانوں کو فاسد کرنے، ان کی قوتوں کو ناکارہ بنانے یا پھر انسانوں کے فاشی و فساد میں مبتلا ہونے یا انسانی معاشرے کی تباہی اور نوع بشر کے انحطاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہو تو یہ بجائے خود اس امر کی تینی اور روشن دلیل ہے کہ یہ مدعی نبوت اپنے دعوے میں سچا نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اس مقام پر بھی ایک عمدہ بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”ایک پیغمبر کے مذہبی مشاہدات کی قدر و قیمت کا فیصلہ (اس کی رسالت اور اللہ کے ساتھ اس کے باطنی رابطے کا حقیقی ہونا)، ہم یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ اس کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے، علی ہذا یہ کہ تہذیب و تمدن کی وہ دنیا تھی جس کا ظہور ان کی دعوت سے ہوا۔“ (تکمیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۳۲)

۶۔ مقابله اور جہاد

هر قسم کے شرک، خرافات و لغویات، جہالت، توہمات، خود ساختہ خیالات، ظلم و ستم، زیادتیوں اور ستم رانیوں سے ٹکر لینا اور ان سے مقابله کرنا بھی نبوت کے ایک مدعی کی سچائی کی علامتوں میں سے ہے۔ یعنی حال ہے کہ ایک شخص جسے اللہ کی طرف سے واقعی پیغمبر بننا کر بھیجا گیا ہو اس کے پیغام میں کوئی ایسی چیز ہو جس سے شرک کی بو

ہے۔ ہمیں صحیح اور یقینی طور پر یہ نہیں معلوم کہ اولو العزم پیغمبروں کی تعداد کیا تھی۔ خصوصاً اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن مجید اس بات کو صاف و صریح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس نے فقط بعض انبیاء کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر قرآن مجید میں تمام اہم پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ قرآن مجید میں مذکورہ پیغمبروں میں سے اولو العزم پیغمبروں کی تعداد معلوم کر لی جاتی۔ بہر کیف ہم اتنا جانتے ہیں کہ حضرت نوحؐ، حضرت ابراہیمؐ، حضرت موسیؐ، حضرت عیسیؐ اور حضرت محمد ﷺ اولو العزم اور صاحب شریعت پیغمبر تھے اور ان میں سے ہر ایک کو وحی کے ذریعے کچھ احکام و قوانین دیئے گئے تھے تاکہ انہیں لوگوں تک پہنچا سکیں اور ان قوانین کی بنیاد پر ان کی رہنمائی کر سکیں۔

دوسرا گروہ ان انبیاء کا ہے جو بذات خود کوئی شریعت اور قوانین نہیں رکھتے بلکہ مخصوص اس شریعت اور قوانین کی تبلیغ و ترویج پر مامور تھے جو اس زمانے میں موجود تھے۔ پیغمبروں کی اکثریت اسی گروہ میں سے تھی جیسے حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؓ، حضرت اسحاقؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت زکریاؑ اور حضرت میحیؑ یہ سب دوسرے گروہ ہی سے ہیں۔

لازماً ہیں، ان میں ہیں۔ انبیاء و رسولوں کی مانند مسکول اور شرعی تکلیف کے حامل ہیں اور جن شرعی ذمہ داریوں کو وہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں، خود ان پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ حرام و حلال ان کے لئے بھی ہے بلکہ بعض شرعی ذمہ داریاں ان کے لئے زیادہ شدید نوعیت کی ہیں جیسا کہ رسول اکرم پر نماز شب یعنی آخر شب میں بیدار رہنا اور نافلہ شب واجب تھی۔

انبیاء بھی اپنے آپ کو تکالیف شرعی اور احکام سمشی نہیں کرتے تھے۔ وہ بھی دوسروں کی طرح اور دوسروں سے زیادہ اللہ سے ڈرتے تھے، دوسروں سے زیادہ خدا کی عبادت کرتے تھے، نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے، جہاد کرتے تھے، زکوٰۃ دیتے تھے، خلق خدا پر احسان کرتے تھے، اپنی اور دوسروں کی زندگی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے تھے اور زندگی میں دوسروں پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔

پیغمبروں اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق صرف وحی کے مسئلے اور وحی کے مقدمات و لوازم میں ہوتا ہے جو انبیاء کو بشر ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ انہیں انسان کامل اور دوسروں کے لئے نمونہ عمل بنادیتی ہے۔ اسی لئے وہ دوسروں کے پیشو اور ہبہ و قائد ہیں۔

۸۔ صاحبان شریعت پیغمبر

انبیاءؐ الہی بطور کلی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ جن کی تعداد کم ہے ان پیغمبروں کا ہے جنہیں خود جدا گانہ طور پر کچھ احکام و قوانین وحی کے ذریعے سپرد کئے گئے اور انہیں مامور کیا گیا کہ یہ قوانین و احکام لوگوں تک پہنچا سکیں اور انہیں قوانین و احکام کی بنیاد پر لوگوں کو ہدایت کریں اور ان کے ہی مطابق لوگوں کو عمل کرنے کی تلقین و تاکید کریں۔ ان انبیاءؐ کو قرآنؐ کی اصطلاح میں ”اولو العزم“ کہا جاتا

طاقت اور انبیاء جو اس طاقت کے مظہر تھے ہمیشہ انسان کو زندگی سے مایوس اور دل سرد کرتے رہے اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ اس اعتبار سے تاریخ میں انبیاء کا کردار ہمیشہ منفی رہا ہے۔ عام طور پر اس قسم کا اظہار نظر وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں روشن فکر ہونے کا دعویٰ ہے۔

۲۔ ایک دوسرਾ گروہ صاحبانِ ادیان کے کردار اور اثرات کو ایک اور طریقے سے منفی قرار دیتا ہے۔ یہ گروہ پہلے گروہ کے برعکس صاحبانِ ادیان کو طالبِ دنیا جانتا ہے اور ان کے معنوی اور باطنی رخ کو ایک فریب اور ان کے دنیاوی پہلو پر ایک نقاب سے تعبیر کرتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ دنیا پسند انہوں نہ راستہ موجود وضع کی حفاظت باقتدار و طاقت ور طبقے کے مفاد میں اور کمزور طبقے کے ضرر و نقصان کے لئے ہوتا ہے اور ہمیشہ معاشرے کی ترقی و کمال کے مقابل رہا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ تاریخ بھی دوسرے تمام موجودات کی طرح جدلیاتی (Dialectic) یعنی اندر و خاری تضاد سے پیدا ہونے والی حرکت کی حامل ہے۔

ماکلیت و اقتدار کے وجود کے سبب معاشرہ دو باہم متنازع طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک حاکم اور فائدہ حاصل کرنے والا طبقہ دوسرا محروم اور فائدہ پہنچانے والا طبقہ۔ حاکم طبقہ اپنے امتیازات کی حفاظت کی غرض سے ہمیشہ موجود صورت حال پر باقی رہنے کا طرف دار رہا ہے۔

پیداواری آلات کی جگہ پیش رفت کے باوجود یہ طبقہ چاہتا ہے کہ معاشرے کو اسی حالت پر قائم رکھ لیکن حکوم طبقہ پیداواری آلات کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چاہتا ہے کہ اس موجود صورت حال کو بالکل الٹ دے اور اس کی جگہ کامل و مکمل صورت حال کو لے آئے۔ حاکم طبقہ نے تین مختلف شکلوں میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ دین حکومت اور دولت دوسرے الفاظ میں زورو زر اور فریب۔ صاحبان

انبیاء کا تاریخی کردار

کیا پیغمبر تاریخ کی حرکت میں ثبت یامنی کردار کے حامل رہے ہیں یا یہ کہ بالکل بے اثر رہے ہیں؟ اور اگر ان کا کوئی کردار رہا ہے تو کیا وہ ثابت تھا یامنی؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پیغمبروں کا تاریخ میں ایک موثر کردار رہا ہے اور وہ معاشرے میں بے اثر نہیں رہے اس کا دین و مذہب کے مخالفین نے بھی انکا رنبیس کیا ہے۔ انبیاء الہی ماضی میں ایک عظیم قومی طاقت کے مظہر رہے ہیں۔ ماضی میں زورو زر کے مل بوتے پر سامنے آنے والی طاقتوں کے مقابلے میں قومی طاقتیں صرف ان طاقتوں پر منحصر ہوتی تھیں جو ان خاندانی قبائلی اور وطنی رجحانات کے نتیجے میں وجود میں آتی تھیں کہ قبلی اور قوم کے سردار جن کے مظہر تصور کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری طاقتیں وہ تھیں جو مذہبی و ایمانی رجحانات کی بنیاد پر وجود میں آئی تھیں اور جن کے مظہر انبیاء و مرسیین اور صاحبانِ ادیان اور اہل دین ہوا کرتے تھے۔

اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ پیغمبر ان خدا الہی قوت و طاقت تھے جنہیں مذہبی قوت حاصل تھی لیکن جو چیز قابل بحث ہے وہ یہ کہ قوت کس طرح اثر انداز ہوتی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مختلف نظریات نے جنم لیا ہے:

- ۱۔ ایک گروہ نے عام طور سے اپنی تحریروں اور آثار میں ایک سادہ سا صغیری و کبیری قائم کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انبیاء کا کردار منفی رہا ہے کیوں کہ انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ معنوی اور دنیا کے برخلاف تھا۔ انبیاء کی تعلیمات کا محور دنیا سے انصراف آخرت کی طرف توجہ دلانا تھا باطن پر زور دینا اور ظاہر سے لائقی ذہنیت کی طرف رجحان اور عینیت سے گریز تھا۔ اسی لئے دین و مذہب کی قوت و

تھے۔ جرمی کا مشہور مادہ پرست فلسفی نظریے کا حامی و طرف دار تھا۔ چونکہ نظریے کی مانند دوسرے مادی جرمی فلسفی بھی اسی روشن پر چلتے رہے اور ان کی سوچ و بچار کے دھارے اسی سمت میں بہتے رہے لہذا اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لکیر کے فقیر بن کر اپنے فسے کو مادی بنیادوں پر استوار کرتے ہوئے اسی نظریے پر گامزن رہے کہ معاصر پیغمبر اور آسمانی تعلیمات غلامانہ اخلاق و کردار کے حامی اور انسانی ترقی و کمال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رہے ہیں اسی سوچ اور مشین دو رکی آمد نے آج مغربی سرمینیوں کو ایسے باسیوں سے آباد کر دیا ہے جن کی اکثریت مذہب سے دوری اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے دہریت کی جانب گامزن ہے انہوں نے مذہب کو ایک بوجہ سمجھ کر اس کا تاریخیکا کیوں کہ وہاں کے مفکرین اور فلاسفہ نے وہاں کے باسیوں کے ذہنوں میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی سوچ کو پرداan چڑھایا جس کی بنیادیں مادیت پر استوار کی گئیں اور جنگ افلاس اور بے سرو سامانی کی اصل وجہات مذہب کو قرار دے دیا گیا اس کے نتیجے میں آج اگر آپ پورپ جائیں تو اس بات کو نہایت آسمانی سے درک کر لیں گے کہ وہاں کے شہریوں نے اپنے ادیبوں فلاسفہ اور مفکرین سے اثر لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج صرف دس فیصد افراد جن میں زیادہ تر بوڑھے شامل ہوتے ہیں مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے اور اتوار کے دن اجتماعی عبادت میں شریک ہوتے ہیں لیکن اس کے بر عکس مشرق کے اکثر فلاسفہ نے مذہب کو معاشرے میں خصوصی مقام دلانے کی کوشش کی ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا تینوں گروہوں کو چھوڑ کر مفکرین ادیان تک بھی ماضی میں پیغمبروں کے کردار کو ثابت اور مفید اور تاریخ کی ارتقا کی سمت میں جانتے ہیں۔ ان گروہوں نے ایک طرف تو پیغمبروں کی اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات اور دوسری طرف تاریخ کے عینی حلق پر توجہ دی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گذشتہ دور میں پیغمبروں کا

ادیان کا کردار ستم گروں اور استحصالی طائفوں کے مفاد میں عوام کو دھوکہ و فریب میں رکھنا تھا۔ ارباب ادیان کا آخرت کی طرف توجہ دلانے کا عمل حقیقی نہیں تھا بلکہ ان کی دنیا پرستی کے چہرے پر فریب کی نقاب تھی جو محروم انقلابی اور پیش قدم طبقے کے ضمیر اور وجدان کو مسخر کرنے کے لئے ڈالی گئی تھی پس ارباب ادیان کا تاریخی کردار اس اعتبار سے منفی تھا کہ وہ ہمیشہ قدامت پسند طبقے کا قوت بازو و محافظ اور موجودہ حالت یعنی صاحبان زور و وزر کے طرف دار رہے ہیں۔ تاریخ کی توجیہ کے سلسلے میں مارکسزم کا نظریہ یہی ہے۔ مارکسزم کی نظر میں یہ تین عامل یعنی دین حکومت اور ثہوت ہمیشہ اصول مالکیت کے ہمراہ اور پوری تاریخ میں انسانوں کے دشمن رہے ہیں۔

۳۔ کچھ افراد مذکورہ بالا نظریات کے برخلاف ایک اور اعتبار سے تاریخ کی تفسیر کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود دین و مذہب اور ان کے مظاہر یعنی پیغمبروں کا کردار منفی سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ عالم طبیعت اور تاریخ کا کمال و ارتقاء اس بنیاد پر استوار ہے کہ طاقت وردوں کا غلبہ رہے اور کمزوری کا خاتمه ہو۔ چنانچہ طاقت و رہی ہمیشہ تاریخ کی ترقی و پیش رفت کا اور کمزور ہمیشہ تاریخ کے جمود اور تندی کا سبب رہے ہیں۔ دین و مذہب طاقت وردوں کو روکنے کے لئے کمزور طبقے کی ایجاد ہے۔ ارباب ادیان عدل سچائی انصاف محبت رحم دلی اور تعاقوں جیسے مفہومیں کو دوسرے الفاظ میں غلامانہ اخلاق کو کمزور یعنی پسمندہ طبقہ اور ارتقاء و کمال کے دشمن طبقے کے حق میں اور طاقت ور طبقے یعنی پیش قدم طبقے کے خلاف ایجاد کرتے ہیں۔ یوں انہوں نے طاقت وردوں پر منفی اثر ڈالا ہے اور کمزوری کے خاتمے نسل انسانی کی اصلاح اور غیر معمولی شخصیات کی پیدائش کی راہ میں رکاوٹ بنے لہذا مذہب اور انہیاء جو اس قوت مذہب کے مظہر تھے کا کردار اس اعتبار سے منفی تھا کہ وہ غلامانہ اخلاق کے طرف دار اور مالکانہ اخلاق کے جو تاریخ اور معاشرے میں ترقی و کمال کا سبب ہے کے خلاف

۱۔ تعلیم و تربیت

زمانہ ماضی میں تعلیم و تربیت کا باعث دینی و مذہبی بیداری رہی ہے۔ ماضی میں مذہبی رجحان معلم اور ماس باپ کا یار و مددگار رہا ہے یہ مورداں موارد میں سے ہے جہاں اجتماعی شعور کے ارتقاء نے مذہبی حرک کی ضرورت کو دور کر دیا ہے۔

۲۔ عہد و پیان پر زندگی استوار کرنا

انسان کی سماجی زندگی معاہدوں اقرار ناموں قراردادوں اور وعدوں عہد کا احترام کرنے پر قائم ہے۔ عہد و پیان کا احترام انسانی تمدن کا ایک رکن ہے اور یہ رکن ہمیشہ مذہب کے ذمہ رہا ہے اور ابھی تک اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے مذہب کی جگہ کسی دوسرے نے نہیں لی۔ ویل ڈیورنٹ جو مذہب مخالف ہے اپنی کتاب ”درہائے تاریخ“ میں لکھتا ہے:

”مذہب نے اپنے آداب و رسوم کی مدد سے انسانی معاہدوں اور بیٹاقوں کو انسان اور خدا کے درمیان باعظمت رابطوں کی شکل دے دی ہے اور اسی راستے سے استحکام و پائیاری کا باعث بن گیا ہے۔“ (درہائے تاریخ ص ۵۵)

مذہب کلی طور پر اخلاقی اور انسانی اقدار کے لئے زرضاخت کی حیثیت رکھتا ہے اور مذہب سے ہٹ کر اخلاقی اقدار کی حیثیت ان نوٹوں کی سی ہے جن کے عوض حکومت کے خزانے میں زرضاخت موجود نہ ہو جس کی بے اعتباری و بے وقتی بہت جلد ظاہر ہو جاتی ہے۔

معاشرے کی فلاج و بہبود اور ترقی و پیش رفت میں بنیادی ترین کردار رہا ہے۔ بشری تمدن کے دو پہلو ہیں: ایک مادی اور دوسرا معنوی۔ تہذیب و تمدن کا مادی پہلو صنعت و فن سے متعلق ہے جو آج تک ارتقائی منازل طے کرتا رہا ہے اور معنوی پہلو ایک انسان کے دوسرے انسانوں سے تعلقات سے ہے تہذیب و تمدن کا معنوی دروحانی پہلو انبیاء کی تعلیمات کا مرہون منت ہے اور تہذیب و تمدن کے اسی معنوی پہلو ہی کے پرتو میں اس کے مادی پہلوؤں میں ترقی کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے لہذا تہذیب و تمدن کے معنوی پہلو کے ارتقاء و کمال میں پیغمبروں کا کردار برآ رہا ہے اور بلا واسطہ رہا ہے جب کہ مادی پہلو کے ارتقاء میں بالواسطہ رہا ہے۔ ان گروہوں کی نظر میں ماضی میں انبیاء کے ثبت کردار میں کوئی کلام نہیں۔ البتہ بعض گروہ ان تعلیمات کے ثبت کردار کو صرف ماضی کی حد تک محدود و مخصوص جانتے ہیں اور آج کل کے دور میں ان تعلیمات کے اثر کو غیر مفید سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ علوم کی ترقی و پیش رفت کی وجہ سے دینی تعلیمات اپنی افادیت کو چھوڑ گیں اور آئندہ ان کی افادیت میں مزید کمی واقع ہو جائے گی لیکن بعض گروہوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ایمان اور مذہبی نظام فکر کا کردار ایسا ہے کہ علمی ترقی کبھی اس کی جگہ نہیں لے سکتی اسی طرح فلسفی مکاتب بھی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ ان مختلف کرداروں کے درمیان جوانبیاء نے ماضی میں ادا کئے ہیں کہیں کہیں اور کبھی کبھی ایسے موقع بھی پیدا ہوتے ہیں جہاں بشر کے اجتماعی شعور کا ارتقاء دینی تعلیمات کی پشت پناہی سے بے نیاز ہوتا ہے لیکن بنیادی کردار وہی ہے جو ماضی میں تھا اور آئندہ بھی اپنی قوت سے باقی رہے گا۔ اب ہم تاریخی ارتقاء و کمال میں پیغمبروں کی تعلیمات کے موثر کردار کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

تسبیح کے بھی۔ علیؑ کا شعار کیا تھا:

کونا للظالم خصما و للمظلوم عونا

”ہمیشہ ظالم کے دشمن اور ستم رسیدہ کے یار و مددگار رہو۔“
 (نوح ال بلاغہ حصہ مکتبات نمبر ۷ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو خطاب)
 علیؑ کو پوری زندگی تسبیح عزیز رہی اور وہ وزر امور کے دشمن رہے علیؑ کی تلوار ہمیشہ صاحب اور اقتدار اور مالکان سیم وزر کے خلاف برس پیکار رہی۔ کتاب محرملہ الحکم البشري میں ”ڈاکٹر علی الوردي“ کے بقول علیؑ نے اپنی شخصیت سے مارکس کے فلسفہ کو باطل کر دیا ہے۔

مارکس کے نظریے سے زیادہ عبث اور لا یعنی نظریہ ”نطیحے“ کا ہے جو مارکس کے نظریے کے بالکل برعکس ہے یعنی چونکہ یہ معاشرے کو مکمال عطا کرنے والا اور پیش قدم طبقہ صرف طاقت وروں کا ہے اور دین کمزوروں کی حمایت کے لئے اٹھا ہے لہذا جگہ و اخحطاط کا عامل رہا ہے گویا انسانی معاشرہ اس وقت ارتقاء و کمال کے راستے پر بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھے گا جب اس پر لاقانونیت اور جنگل کے قانون کی حکومت ہوگی۔ مارکس کی نظر میں کمال کا سبب محرومیوں کا طبقہ ہے اور نبی اس طبقہ کے مخالف رہے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ دین طاقت وروں اور دولت مندوں کی اختراع ہے جب کہ ”نطیحے“ کہتا ہے کہ دین کمزوروں اور محرومیوں کی اختراع ہے۔ کارل مارکس کا ایک اشتباہ یہ ہے کہ اس نے صرف طبقاتی مقادیات کے تضاد کی بنیاد پر تاریخ کی توجیہ کی ہے اور تاریخ کے انسانی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں رسالہ قیام انقلاب مہدی از دیدگاہ فلسفہ تاریخ مولف استاد شہید مطہری)

دوسرा اشتباہ یہ ہے کہ اس ارتقاء و کمال کا عامل صرف محروم اور کمزور طبقہ کو سمجھا ہے۔

۳۔ اجتماعی قید و بند کی آزادی

ہر طرح کے ظلم و ستم و استبداد اور سرکش عناصر سے مقابلہ انبیاءؑ کا اہم ترین کردار رہا ہے۔ قرآن ان کے کلیدی کردار کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ قرآن کریم اولاد تو عدل و انصاف کے قیام کو بعثت و رسالت کے ہدف کے عنوان سے ذکر کرتا ہے اور ثانیاً اپنے واقعات میں ظالموں جابریوں اور استبدادی طاقتیوں کے خلاف انبیاءؑ کی جدوجہد کو بارہا بیان کرتا ہے۔ قرآن نے چند آیتوں میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ جو طبقہ ہمیشہ سے انبیاءؑ کے ساتھ مصروف پیکار رہا ہے وہ استبدادی اور ظالم طاقتیوں کا طبقہ ہے۔

کارل مارکس اور اس کے پیروکاروں کا یہ نظریہ یہ کہ دین حکومت اور دولت و شرودت حاکم طبقے کے تین مختلف چہرے ہیں جو مظلوم و مجبور طبقے کے مخالف رہے ہیں ایک بے قیمت نظریہ ہے اور تاریخ کے مسلمہ حقائق کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر ارانی نظریہ مارکس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ذہب ہمیشہ حاکم اور بر اقتدار طبقے کا آله کار رہا ہے اور ضعیف و کمزور طبقے کو مغلوب کرنے کے لئے تسبیح و صلیب نے ہمیشہ استبدادی قوتوں کے ساتھ ہی حرکت کی ہے۔“

(یہ قول ڈاکٹر ارانی کتاب ”اصول علم روح“ سے نقل کیا گیا ہے)
 تاریخ کی اس قسم کی توجیہات اور اس قسم کے فلسفہ تاریخ کو قبول کرنا صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ یہ کہ آدمی حقائق سے چشم پوشی کر لے اور تاریخی واقعات کو نظر انداز کر دے۔

علیؑ علیہ السلام تسبیح و تسبیح دونوں کے مردمیدان تھے تلوار کے بھی دھنی تھے اور

مقصد بعثت انبياء

تاریخ کے ارتقائی سفر میں انبیاء اکا کردار کسی حد تک واضح ہو گیا ہے۔ اب ایک دوسرا مسئلہ زیر بحث ہے اور وہ یہ کہ انبیاء اکے مبouth ہونے کا اصل مقصد کیا تھا؟ دوسرے الفاظ میں رسولوں کے بھیجنے اور کتابوں کے نازل کرنے کی غایت نہائی کیا تھی؟ پیغمبروں کا حرف آخر کیا ہے؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اصل بدف و مقصدو لوگوں کو ہدایت لوگوں کی سعادت و خوش بختی لوگوں کی نجات اور لوگوں کی فلاح و بہبود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء لوگوں کو راہ راست کی طرف ہدایت کرنے اور لوگوں کے لئے خوش بختی اور نجات کا سامان مہیا کرنے اور لوگوں کی خیر و صلاح اور فلاح و بہبود کے لئے مبouth ہوئے ہیں۔ اس وقت اس مسئلے پر فتنگو کرنا مقصود نہیں بلکہ بحث اس میں ہے کہ یہ راہ راست کس انتہائی منزل مقصود پر ختم ہوتی ہے؟ مکتب انبیاء کی نظر میں لوگوں کی سعادت و بجلائی کا کیا مطلب ہے؟ یہ مکتب کون سی قیود و مشکلات مشخص کرتا ہے جن سے لوگوں کو نجات دینا چاہتا ہے؟ یہ مکتب خیر و صلاح اور فلاح و بہبود کو کس چیز میں سمجھتا ہے؟

قرآن نے ان تمام مطالب و معانی کی طرف اشارہ یا تصریح کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے دو مفہومیں و معانی کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اصلی مقصد کی طرف رسائی ہوتی ہے یعنی پیغمبروں کی ساری تعلیمات انہی دو بالوں کی تمہید ہے۔ وہ ہیں ایک خدا کو پیچانا اور اس کی قربت حاصل کرنا اور دوسرا انسانی معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنا اور قائم رکھنا۔

قرآن کریم ایک طرف کہتا ہے:

تیسرا غلطی یہ ہے کہ انبیاء اکو حاکم طبقے کا بازو اور طرف دار قرار دیا ہے لیکن اس نے دانا تر انسان کو سب سے طاقت و را انسان کے برابر سمجھا ہے اور سب سے طاقت و را انسان ہی کو انسانی معاشرے کو آگے بڑھانے والا عامل مانا ہے۔

پیش کیا جاسکتا ہے کہ آیا اصل ہدف توحید نظری اور توحید عملی و فردی ہے یا اصل ہدف توحید عملی و اجتماعی ہے۔ اس سلسلے میں کئی نظریات قائم کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ پیغمبران خدا دو مقصد رکھتے ہیں۔ ان دونوں مقاصد میں سے ایک کا تعلق انسان کی اخروی زندگی سے ہے (یعنی توحید نظری اور توحید عملی و فردی) اور دوسرا مقصد انسان کی دنیاوی سعادت سے متعلق ہے (یعنی توحید اجتماعی)۔ انبیاء کرام اس اعتبار سے کہ انسان کی دنیوی سعادت کی فکر میں رہے ہیں لہذا انہوں نے توحید اجتماعی کو برقرار کیا اور اس لحاظ سے کہ انسان کی اخروی سعادت مذکور تھی تو توحید نظری اور توحید عملی و فردی کو بھی جو محض ذہنی و روحانی ہے قائم کیا۔

۲۔ اصل مقصد توحید اجتماعی ہے جب کہ توحید نظری اور توحید عملی و فردی توحید اجتماعی کا لازمی مقدمہ ہے۔ توحید نظری کا تعلق خدا شناسی سے ہے۔ انسان کے لئے اپنی ذات کی حد تک خدا کو پہچاننے یا نہ پہچاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی روح کو حرکت دینے والا اللہ ہو یا دوسری ہزاروں چیزیں جیسا کہ بطریق اولیٰ اللہ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انسان اس کو پہچاننے یا نہ پہچانے۔

اس کی عبادت کرے یا نہ کرے لیکن اس لحاظ سے کہ انسان کا کمال "ہم" ہونے اور توحید اجتماعی میں ہے اور یہ چیز توحید نظری اور توحید عملی و فردی کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی سے خدا نے اپنے بندے پر اپنی معرفت اور عبادت فرض کی ہے تاکہ توحید اجتماعی کی عملی شکل سامنے آئے۔

۳۔ اصل ہدف اللہ کو پہچانا اور اس کی قربت حاصل کرنا اور اس تک پہنچنا ہے اور توحید اجتماعی اسی بلند مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ اور مقدمہ ہے کیوں کہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے تو حیدی اور الہی تصورات کا ناتاں میں کائنات کی ماہیت "اسی سے" اور "اسی کی طرف" سے عبارت ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا کمال اس کی طرف جانے اور اس

یَا إِيَّاهَا النَّبِيُّ إِنَّا آتَيْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًّا إِلَى

اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسَرَاجًا مُنِيرًا ﴿٦﴾

"اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہ خوشخبری دینے والا ڈرانے والا اللہ کی طرف سے اس کی اجازت سے بلا نے والا اور وشن چراغ بنایا کر بھیجا۔" (احزاب)

اس آیت میں جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف بلا نا ہی وہ چیز ہے جسے اصل ہدف قرار دیا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف تمام پیغمبروں کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا إِلَيْبَيْنِتْ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمُبِيْذَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴿٤﴾

"ہم نے اپنے پیغمبروں کو روشن دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور معیار و میزان کو نازل کیا تاکہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھ سکیں۔" (سورہ حمدید - ۲۵)

اس آیت میں واضح طور پر عدل و انصاف قائم کرنے کا نبیاء کی رسالت و بعثت کا ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کی طرف بلا نے اسے پہچاننے اور اس کے قریب ہونے سے مراد توحید نظری اور توحید عملی و فردی کی طرف دعوت دینا ہے جب کہ معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنے سے مراد توحید عملی و اجتماعی کی طرف بلا نا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیغمبروں کا اصل مقصد خدا کو پہچانا اور اس کی پرستش کرنا ہے اور دوسری تمام چیزیں یہاں تک کہ اجتماعی عدل و انصاف بھی اس ہدف تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے یا اصل ہدف عدل و انصاف کا قیام ہے جب کہ اللہ کو پہچانا اور اس کی عبادت کرنا اس اجتماعی مقصد تک پہنچنے کا وسیلہ ہے یا اس مسئلے کو یوں بھی

برابری و برابری کے سائے میں عالم طبیعت کے عطیات و انعامات سے مستفید ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی محفوظ مادہ پرستی ہے۔

لیکن تیرے نظریے کے برخلاف اگرچہ اجتماعی و اخلاقی اقدار انسان کی حقیقی قدر و قیمت تک پہنچنے کے لئے یعنی انسان کو خدا پرستی اور خدا تعالیٰ تک پہنچانے کے لئے وسیلہ ہیں لیکن اپنی ذات میں بے قدر و قیمت نہیں ہیں۔

اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مقدمہ اور ذوالمقصدہ (اصل مقصد) کے درمیان رابطہ و تعلق و قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قسم میں مقدمے کی قدر و قیمت صرف اتنی ہوتی ہے کہ ذوالمقصدہ یعنی مقصد تک پہنچا دے اور اصل مقصد تک پہنچ جانے کے بعد اس مقدمے کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا ہے مثلاً ایک انسان نہر سے عبور کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ ایک بڑے پتھر کو وسیلہ قرار دیتا ہے نہر سے عبور کرنے کے بعد اس انسان کے لئے اس پتھر کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ اس لئے کہ اصل مقصد دوسرے کنارے پر پہنچنا تھا۔ اسی طرح مکان کی چھت پر جانے کے لئے سیڑھی کا استعمال اور بڑی کلاس میں داخلے کے لئے چھوٹی کلاس کا نتیجہ ہے۔

دوسری قسم اس رابطے کی ہے جہاں مقدمہ اصل مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ تو ہوتا ہے اور اصل قدر و قیمت بھی اس مقصد کی ہی ہوتی ہے لیکن اصل مقصد تک پہنچنے کے بعد اس کا وجود و عدم مساوی نہیں ہوتا اور مقصد کے حاصل ہونے کے بعد بھی مقدمہ کا وجود اسی طرح ضروری ہوتا ہے جس طرح حصول مقصد سے پہلے تھا مثلاً پہلی اور دوسری کلاس کی معلومات کا ہونا اس سے بالاتر کلاس کی معلومات کے لئے ضروری ہے لیکن ایسا نہیں کہ اوپر کی کلاس تک پہنچنے کے بعد ان معلومات کی ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ اگر بالفرض ابتدائی کلاسوں میں جو معلومات حاصل کی تھیں وہ سب فراموش ہو جائیں طالب علم کا ذہن بالکل خالی ہو جائے تو کیا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور کیا وہ

کی قربت حاصل کرنے ہی میں ہے۔ انسان کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ آیہ شریفہ واذ انفخت فیہ من روی (سورہ حجر آیت ۲۹) اور جب میں نے اس میں اپنی (عالیٰ و برتر) روح میں سے پھونکا کی رو سے انسان کی حقیقت الہی نظر آتی ہے۔ خدا جوئی انسان کی فطرت ہے۔ اس لحاظ سے اس کی بیک بختی اس کا کمال اس کی نجات اس کی بھلائی صداقت اور استغفار اللہ کی معرفت اس کی پرستش اور اس کی قربت کی منزلیں طے کرنے میں ہے لیکن چونکہ انسان طبیعتاً مدنی و اجتماعی ہے یعنی اگر انسان کو معاشرے سے جدا کر لیں تو وہ انسان نہیں رہ سکتا اور اگر معاشرے میں عادلانہ اجتماعی نظام کی حکمرانی نہ ہو تو انسان میں پائی جانے والی خدا جوئی کی فطرت بیدار نہیں ہو سکتی۔ تمام انبیاء اعدل و انصاف قائم کرنے اور ظلم و استھصال کو ختم کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ اس بناء پر عدل آزادی برابری اور جمہوریت جیسی اجتماعی اقدار اور اس طرح اجتماعی اخلاق مثلاً جود و سخا، عفو و درگزرمجحت و احسان کوئی ذاتی قدر و قیمت نہیں رکھتے اور محفوظ ذاتی طور پر انسان کے لئے ان میں کوئی کمال کا پہلو نہیں ہے۔ ان سب کی تمام تر قدر و قیمت اور اہمیت مقدمے اور وسیلے کی حد تک ہے اور اگر انہیں اصل مقصد سے الگ کر کے دیکھا جائے تو ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ یہ سب حصول کمال کے ذرائع ہیں نہ کہ خود کمال۔ یہ فلاج و نجات کے لئے مقدمہ ہیں نہ کہ خود فلاج و نجات رستگاری کے وسائل ہیں نہ کہ خود رستگاری۔

۳۔ چوچھا نظریہ یہ ہے جیسا کہ تیرے نظریے میں بیان ہوا انسان کی غرض و غایت اور اس کا کمال بلکہ ہر موجود کا حقیقی کمال اور ہدف خدا کی طرف حرکت کرنے پر تمام ہوتا ہے۔ اس بات کا دعویٰ کرنا کہ انبیاء اور رسول اپنے ہدف کے اعتبار سے شتوی تھے ایک ایسا شرک ہے جو ناقابل معافی ہے۔ جیسا کہ یہ دعویٰ کرنا بھی کہ پیغمبر وہ اصل مقصد بندگان خدا کی دنیوی فلاج و سعادت ہے اور دنیوی سعادت عدل آزادی

اس کا منکر بھی ہو۔

اسی لئے اسلامی تعلیمات کی رو سے عدالت احسان اور جود و سخا جیسے اخلاق فاضلہ کے حامل افراد اگرچہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں لیکن دوسری دنیا میں ان کے اعمال بے اثر نہیں رہیں گے اس قسم کے افراد کا کفر و شرک اگر عناد اور سرکشی کی بناء پر نہ ہو تو ان لوگوں کو دوسری دنیا میں کچھ نہ کچھ اجر ضرور ملے گا۔ درحقیقت اس قسم کے افراد لا شعوری طور پر خدا پرستی کے کسی نہ کسی درجے تک پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

(مزید تفصیل کیلئے مولف کی کتاب عدل اللہ کے آخری باب کی طرف
رجوع کریں)

بالآخر کلاس میں پڑھ سکے گا؟ نہیں! بلکہ ان سابقہ معلومات کا ہونا بے حد ضروری ہے اور تبھی وہ اپر کلاس میں تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔

اس دوسری قسم میں جو راز پوشیدہ ہے وہ یہ کہ کبھی مقدمہ ذوالمقصدہ (اصل مقصد) کا کم تر درجہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ سیڑھی مکان کی چھت کے درجات و مراتب میں سے نہیں ہے جیسا کہ نہر کے درمیان رکھا جانے والا بڑا پتھر نہر کے اس پار کے درجات میں سے نہیں ہے لیکن خلی کلاسوں کی معلومات اور بالائی کلاسوں کی معلومات ایک ہی حقیقت کے و مختلف رخ ہیں۔

معاشرتی و اخلاقی اقدار اللہ کی معرفت و پرستش کے حوالے سے دوسری قسم میں داخل ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر انسان کو خود اللہ کی کامل معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کے نزدیک عدل و انصاف سچائی بھلائی جود و کرم احسان و خیر خواہی عنووی مروت اور محبت وغیرہ سب کا وجود و عدم برابر ہواں لئے کہ بلند و بالا انسانی اخلاق ایک طرح کے خدائی رنگ کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ روایت میں بھی ہے:

تخلقوا بآخلاق الله

”اپنے کو الہی اخلاق و انصاف سے آراستہ کرو۔“

(جامع الاسرار سید حیدر آملی ص ۳۶۳)

اخلاق عالیہ سے آراستہ ہونا اگرچہ غیر شعوری طور پر سکی لیکن درحقیقت خدا شناسی اور خدا پرستی کا ہی ایک درجہ اور مرتبہ ہے یعنی انسان کا ان اقدار سے تعلق الہی اوصاف سے متصف ہونے کے ساتھ فطری لگاؤ سے پیدا ہوتا ہے اگرچہ انسان ان اوصاف کے فطری رشتہ تعلق کی طرف بالکل متوجہ نہ ہو بلکہ کبھی کبھی وہ شعوری طور پر

تعلیمات کے درمیان علمی سطح کے اعتبار سے زمین سے آسمان تک فرق نظر آئے گا۔ دوسرے الفاظ میں ان انبیاء ا کی تعلیمات سے فائدہ حاصل کرنے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے تھا جسے ان الٰہی اساتذہ نے یک بعده گیرے آہستہ آہستہ پہلے درجے سے ترقی دیتے ہوئے آخر میں بالائی درجے تک پہنچایا ہے۔ یہ دنیا کا تدریجی ارتقاء ہے نہ کہ ادیان کا اختلاف۔ قرآن مجید نے کہیں بھی لفظ دین کو جمع (ادیان) کی صورت میں استعمال نہیں کیا۔ قرآن مجید میں جس چیز کا وجود تھا وہ دین تھا نہ کہ ادیان۔ ایک واضح فرق پیغمبروں اور بڑے بڑے فلاسفیوں اور ماہرین کے درمیان یہ بھی ہے کہ فلاسفہ میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص نظریہ اور مکتب فکر تھا لیکن پیغمبر ان خدا ہمیشہ ایک دوسرے کی تائید و تقدیق کرنے والے رہے ہیں انہوں نے کبھی ایک دوسرے کی نفع نہیں کی۔ پیغمبروں میں سے اگر کوئی کسی دوسرے پیغمبر کے زمانے اور ماحول میں ہوتا تو اسی کے قوانین اور احکام کی مانند قوانین لاتا۔

قرآن اس بات کو صراحت سے بیان کرتا ہے کہ (از آدم اتا خاتم) تمام انبیاء ا کا ایک سلسلہ تھا اور سب ایک آسمانی سلسلے میں منسلک تھے گذشتہ انبیاء ا اپنے بعد آنے والے پیغمبروں کی بشارت دیتے رہے اور بعد میں آنے والے انبیاء ا گذشتہ انبیاء ا کی تصدیق و تائید کرتے رہے نیز قرآن کریم اس امر کی بھی تصریح کرتا ہے کہ تمام انبیاء ا سے اس بات کا سخت عہد و پیمان لیا گیا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے مبشر و مصدق ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: (اے میرے رسول) اس وقت کو یاد کرو جب خداوند عالم نے تمام پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دوں گا پھر تمہارے پاس ایک پیغمبر تمہاری رسالت کی تصدیق کرتے ہوئے آئے گا تو تم سب اس کے اوپر ضرور ایمان لانا اور اس کی ضرور مرد کرنا پھر (خدا نے فرمایا) کہ کیا تم نے اقرار کیا اور کیا تم نے میرا عہد اپنے ذمے لے لیا؟ (تو ان سب

دین یا دین؟

علم دین سے تعلق رکھنے والے علماء اور مذاہب کی تاریخ لکھنے والے عام طور سے ادیان کے بارے میں بحث کرتے ہوئے دین ابراہیم ا دین یہود دین مسیحی اور دین اسلام کی بات کرتے ہیں گویا ہر ایک صاحب شریعت پیغمبر کو ایک علیحدہ دین لانے والا سمجھتے ہیں عام لوگوں کے درمیان بھی یہی اصطلاح رائج ہے۔

لیکن قرآن مجید اس بارے میں ایک خاص اصطلاح اور طرز بیان رکھتا ہے جس کا سرچشمہ قرآن ہی کا خاص نظریہ ہے قرآن مجید کی نظر میں حضرت آدم اسے لے کر حضرت خاتم الانبیاء تک اللہ کا دین ایک ہی ہے۔ تمام پیغمبر چاہے وہ صاحب شریعت ہوں یا ان کے علاوہ سبھی ایک مکتب کے دائی تھے اور ایک دین کے مبلغ تھے۔

مکتب انبیاء ا کے اصول جنہیں دین کہا جاتا ہے ایک ہیں البتہ ایک توسیع کے درمیان فرعی مسائل میں کچھ اختلاف ضروری ہے جو عصری تقاضوں ماحول اور لوگوں کی خصوصیات کے اعتبار سے نظر آتا ہے لیکن ان تمام مختلف شکلوں کی حقیقت ایک ہی ہے سب ایک ہی مقصد و ہدف کی طرف رواں ہیں۔ دوسرافرق تعلیمات کی علمی سطح پر نظر آتا ہے کیوں کہ جیسے جیسے انبیاء آتے رہے اور شریعتیں لاتے رہے اور اپنی مقدس تعلیمات سے بندگان خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے ویسے ویسے انسانی معاشرہ علوم و معارف میں ترقی و کمال کی منزلیں طے کرتا رہا اور تدریجیاً آگے بڑھتا رہا اسی بناء پر ہر بعد میں آنے والے صاحب شریعت پیغمبر نے اپنی تعلیمات کو اس سطح سے بلند رکھا جہاں تک اس سے قبل والے پیغمبر نے پہنچا تھا۔ مگر حقیقت میں سب کا موضوع ایک تھا لیکن مبداء و معاد اور دنیا کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور گذشتہ پیغمبروں کی

ختم نبوت

ہم اور بیان کرچکے ہیں کہ پیغمبر ان خدا باوجود جزوی اختلافی مسائل کے سب صرف ایک پیغام کے حامل و مبلغ اور ایک مکتب سے وابستہ تھے یہ مکتب انسانی معاشرے کی فکری صلاحیت کے مطابق درجہ بردرج پیش کیا گیا یہاں تک کہ انسانی معاشرہ فکری رشد کے لحاظ سے اس حد تک پہنچ گیا کہ یہ مکتب اور یہ نظریہ مکمل و جامع شکل میں پیش کیا گیا۔ جب مکتب اس درجہ عروج و کمال کو پہنچ کیا تو نبوت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا اور وہ عظیم و مقدس شخصیت جن کے ذریعے سے یہ مکتب کامل شکل میں پیش کیا گیا وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات ہے اور اس مکتب کا آخری مکمل نصاب اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ

”تمہارے پروردگار کا سچا اور عادلانہ پیغام پورا ہو گیا اس میں کوئی تبدیلی لانے کی کسی میں طاقت نہیں ہے۔ (سورہ النعام آیت ۱۱۵)

اب ہمیں غور کرنا ہو گا کہ ماضی میں کیوں نبتوں کی تجدید ہوتی رہی ہے اور ایک کے بعد دوسرے پیغمبر برابر آتے رہے اگرچہ وہ تمام پیغمبر صاحبان قانون و شریعت نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر انبیاء اپنے زمانے میں موجود شریعت و قانون ہی کے مبلغ رہے ہیں اور حضرت محمد ﷺ کے بعد یہ سلسلہ انبیاء ا کیوں ختم کر دیا گیا اور نہ صرف یہ کوئی صاحب شریعت پیغمبر نہیں آیا اور نہ آئے گا بلکہ مبلغ کی حیثیت سے بھی کوئی پیغمبر نہیں آیا اور نہ قیامت تملک آئے گا کیوں؟ اس مقام پر ہم محض طور پر نبتوں کی تجدید کے عمل و اسباب پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

نے) کہا: ہم نے اقرار کیا (پھر خدا نے) فرمایا: ”تم گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔“ (آل عمران آیت ۸۱)

قرآن کریم نے کہ جو دین خدا کو آدم اسے خاتم تک ایک ہی جاری رہنے والے سلسلے کی حیثیت سے پہنچواتا ہے نہ کہ چند کڑیوں کے عنوان سے اس سلسلے کا صرف ایک نام رکھا ہے اور وہ ہے اسلام۔ ہمارے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دین خدا ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے اس نام سے پکارا جاتا رہا ہے یا یہی نام لوگوں کے درمیان مشہور و معروف رہا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ دین کی حقیقت ایک ایسی ماہیت رکھتی ہے جس کا بہترین معرف اور عنوان لفظ اسلام ہے۔

قرآن کہتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا إِسْلَامُهُ (آل عمران آیت ۱۹)

یادو سری جگہ کہتا ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصَارَىً وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا (آل عمران آیت ۶۴)

”ابراهیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ حق کی تلاش کرنے والے اور مسلم تھے۔“

اس بات پر قادر نہیں تھی کہ اپنی زندگی کے لئے مکمل طور پر کوئی آئین اور لائچے عمل مرتب کر سکے جس کی راہنمائی میں وہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکے اس لئے ضروری تھا کہ مرحلہ بہ مرحلہ اور منزل بہ منزل اس کی راہنمائی کی جاتی رہے اور ایک یا کئی رہبر و رہنماء ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔

لیکن حضرت خاتم الانبیاء کے مبارک دور میں اور اس کے بعد قوت و توانائی جو کلی اور مکمل لائچے عمل مرتب کر سکے انسان کو حاصل ہو چکی تھی الہذا مرحلہ بہ مرحلہ اور منزل بہ منزل والا لائچے عمل مرتب کرنے کی ضرورت ختم ہو گئی اور اس کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ شریعتوں کی تجدید کا سبب مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ یہ بھی تھا کہ انسان اس بات پر قادر نہیں تھا کہ اپنے واسطے کوئی مکمل اور جامع پروگرام بنائے اور جب یہ قوت و طاقت اور صلاحیت اس میں پیدا ہو گئی تو مکمل اور جامع پروگرام تیار کرنے کا کام خود اس کے اختیار میں دے دیا گیا اور نبتوں اور شریعتوں کی تجدید کا یہ دوسرا سبب بھی ختم ہو گیا۔ امت کے علماء ماہر اور سپیشلٹس ہونے کی بناء پر اسلام کے پیش کردہ مکمل و جامع لائچے عمل اور ضابطہ حیات سے استفادہ کرتے ہوئے آئین اور دستور العمل کی ترتیب و تدوین کر کے بشریت کی راہنمائی کر رہے ہیں۔

۳۔ پیغمبروں کی کثیر تعداد دین کی مبلغ تھی نہ کہ صاحب شریعت بلکہ صاحب شریعت پیغمبروں کی تعداد شاید ایک ہاتھ کی انگلیوں کی تعداد سے زیاد نہیں ہے۔ مبلغ کی حیثیت سے آنے والے پیغمبروں کا کام اس شریعت کی تبلیغ و ترویج اور تفسیر کرنا اور اسے نافذ کرنا تھا جو ان کے زمانے کے افراد کے درمیان موجود تھی۔ اس خاتمیت کے دور میں کہ جو عصر علم و دانش ہے علمائے اسلام اس بات پر قادر ہیں کہ اسلام کے عمومی اصولوں کی معرفت اور زمان و مکان کی شرائط سے واقفیت اور آگاہی حاصل کر کے ان عمومی اصولوں کو زمان و مکان کے تقاضوں سے احکام الٰہی کا استخراج و استنباط

نبتوں کی تجدید کے اسباب

اگرچہ نبوت ایک متصل اور جاری رہنے والا اسلام اور پیغام الٰہی ہے یعنی دین صرف ایک حقیقت ہے ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ صاحب شریعت اور مبلغ کی حیثیت سے آنے والے پیغمبروں کی تجدید اور متواتر ایک کے بعد دوسرے پیغمبر کے آنے اور حضرت خاتم الانبیاء اکی شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس سلسلے کے منقطع ہو جانے کے علی و اسباب حسب ذیل ہیں:

۱۔ زمانہ قدیم کا انسان اپنی استعداد اور فکر کے اعتبار سے اس قابل نہ تھا کہ اپنی آسمانی کتاب کی حفاظت کر سکے اسی وجہ سے آسمانی کتاب میں عموماً تحریف کا شکار ہوا جایا کرتیں یا بالکل ہی فنا ہو جاتیں اس بناء پر یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ پیغام کی تکرار کی جائے۔ نزول قرآن کا زمانہ یعنی آج سے چودہ سو سال قبل کا دور تھا جب انسانی معاشرہ اپنے زمانہ طلفی کو بہت پیچھے چھوڑ کر حد بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور اس وقت انسان اپنی علمی و دینی میراث کی حفاظت کرنے پر قادر ہو چکا تھا اسی وجہ سے سب سے آخری مقدس و مکمل کتاب یعنی قرآن کریم میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی مسلمان اس کی ہر آیت کی حفاظت اس کے وقت نزول سے ہی اپنے ذہنوں اور تحریروں کے ذریعے کرتے رہے اور اس طرح سے اس کی حفاظت کرتے رہے کہ اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل تبدیلی و تحریف حذف و اضافہ کا امکان ہی باقی نہ رہے یہی وجہ ہے کہ اس مقدس اور آسمانی کتاب میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں ہو سکی اور اس طرح نبتوں کی تجدید کے اسباب میں سے ایک سبب تو بالکل ہی ختم ہو گیا۔

۲۔ گذشتہ ادوار میں بشریت اپنی صلاحیت اور فکری قابلیت کے اعتبار سے

روشنی میں کلیات و حی کی توجیہ و تفسیر کر سکے اور زمان و مکان کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہر مسئلے کو اس سے متعلقہ اصول کی طرف موڑ سکے۔ اس اہم کام کو بھی امت کے علماء انجام دے رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ختم نبوت کے معنی یہ نہیں کہ اب انسان کو حی کے ذریعے سے پہنچنے والی الہی اور تبلیغی تعلیم کی ضرورت نہیں رہی اور چونکہ انسان کو اس فطری بلوغ کی وجہ سے ان تعلیمات کی ضرورت نہیں رہی اس لئے نبوت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ جدید و حی اور جدید نبی و رسول کی ضرورت نہیں نہ کہ الہی دین اور اس کی تعلیمات کی ضرورت ختم ہو گئی ہے۔

مشہور و عظیم اسلامی مفکر علامہ اقبال اسلامی مسائل میں اپنی تمام تر نکتہ چینیوں اور دقت نظر (جن سے ہم نے اس کتاب اور دوسری کتابوں میں بہت زیادہ استفادہ کیا ہے) کے باوجود فلسفہ ختم نبوت کی توجیہ و تفسیر میں سخت اشتباہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ موصوف نے اس بحث کی بنیاد چند اصولوں پر رکھی ہے:

ا- وحی

اس کے لغوی معنی "آہستہ اور رازدارانہ انداز میں بات کرنا" ہیں۔ اس لفظ کا قرآن مجید میں وسیع مفہوم ہے جو مرموٹ اور خفیہ ہدایتوں کی بہت سی قسموں پر محیط ہے اور جو جمادات اور حیوان کی ہدایت سے لے کر انسان تک کی ہدایت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں: اصول وجود کے ساتھ یہ اتصال کسی طرح بھی صرف انسان کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ قرآن میں لفظ وحی کا طریقہ استعمال یہ بتاتا ہے کہ یہ کتاب اس "وحی" کو زندگی کی ایک خاصیت جانتی ہے۔

کریں۔ اسی عمل کا نام اجتہاد ہے اور امت اسلامی کے لاکٹ وقابل علماء مبلغ کی حیثیت سے آنے والے انبیاء اکے بہت سے فرائض اور صاحب شریعت انبیاء اکے کچھ فرائض اپنی طرف سے کوئی شریعت لائے بغیر عمل اجتہاد کے ذریعے امت کی رہنمائی کے خاص فریضے کو انجام دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے جہاں دین کی ضرورت ہمیشگی حیثیت کی حامل ہے بلکہ بشریت جس قدر تہذیب و تمدن اور ترقی و کمال کی منزلیں طے کرتی جاتی ہے دین کی احتیاج اور زیادہ ہو جاتی ہے، وہاں نبوت و شریعت کی تجدید اور کسی جدید آسمانی کتاب یا نئے پیغمبر کے آنے کی ضرورت بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور نبوت کا سلسلہ بھی۔

(ختم نبوت کی مفصل بحث کیلئے مولف کی کتاب "ختم نبوت" کا مطالعہ کریں)

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ختم نبوت میں بشر کی اجتماعی اور فکری بلوغت اور پیچگی کا نہایت اہم کردار رہا ہے اور اس کردار کے کئی پہلو ہیں:

- ۱۔ فکری اور اجتماعی بلوغت نے آسمانی کتاب کو تحریف سے محفوظ رکھا ہے۔
- ۲۔ یہ فکری رشد اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ انسان نے اپنے ارتقائی پروگرام کو منزل بہ منزل کے بجائے ایک ہی مرحلے میں اپنی تحولی میں لے لیا اور اس سے استفادہ کیا۔

- ۳۔ اجتماعی اور فکری پیچگی اور سمجھداری اسے اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ دین کو برقرار کرے اور اس کی ترویج و تبلیغ امر بالمعروف اور نبی عن المنکر جیسے فرائض کی ذمہ داری قبول کرے۔ اس سے مبلغ کی حیثیت سے آنے والے پیغمبروں کی ضرورت ختم ہو گئی اور اب اس ضرورت کو امت کے علماء پورا کرتے ہیں۔
- ۴۔ بشریت اپنی فکری پیچگی کے لحاظ سے اس منزل پہنچ گئی کہ وہ اجتہاد کی

قوت ان کی جانشین ہوتی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حشرات سب سے زیادہ اور سب سے قوی جلستیں رکھتے ہیں اور انسان سب سے کم تر جلی قوتوں کے حامل ہوتے ہیں۔

۵۔ انسانی معاشرہ اجتماعی لحاظ سے ایک ترقی پذیر معاشرہ ہے اور راہ کمال پر گامزد ہے اور جس طرح ابتدائی مرافق میں حیوانات جلی شعور کے محتاج ہوتے ہیں اور جوں جوں احساس تخيّل اور کبھی فکر کی قوت ان کے اندر بڑھتی جاتی ہے اسی طرح فکری اور حسی ہدایتیں جلی شعور کی جانشین ہوتی جاتی ہیں۔ انسانی معاشرہ بھی اپنے تکالیٰ سفر میں اس منزل پر پہنچ گیا جہاں تعقل اور سوچنے سمجھنے کی قوت کی روشن و پتھنگی اس کے اندر پائی گئی اور یہی امر جلی شعور و قوت (وہی) کے ضعف اور کم تری کا سبب بن گیا ہے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں: ”بشریت کے دور طفیل میں روحانی طاقت ایک چیز کو ظاہر کرتی ہے جس کو میں ”پیغمبرانہ خود آگاہی“ کا نام دیتا ہوں تیار شدہ احکام بزرگوں کے فیضوں اور تجربے سے حاصل شدہ منتخبات کی پیروی سے انسان اپنی انفرادی فکر اور راہ زندگی کے انتخاب میں تضییغ اوقات سے بچتا ہے لیکن عقل کے کامل ہونے اور اس میں تقيیدی قوت کے پیدا ہو جانے کے بعد زندگی اپنے فائدے کے لئے اس قسم کی خود آگاہی کوششوں نمادیے کے لئے پہلے مرحلے کی روحانی طاقت (وہی) کو روک دیتی ہے۔ انسان پہلے خواہشات اور جلی قوت کا حکوم و مطیع ہوتا ہے۔ استدلال کرنے والی عقل و جو ماحول پر اس کے مسلط ہونے کا واحد سبب ہے بجائے خود ایک ترقی و پیش رفت ہے اور چونکہ عقل وجود میں آئی تو چاہئے کہ معرفت کی دوسرا شکلوں (جلی شعور اور رہنمائی) کو روک کر اسے تقویت پہنچا سکیں۔ (احیاء فکر دینی دراسلام ص ۱۲۵)

۶۔ دنیائے بشریت دنیادی ادوار پر مشتمل ہے: ایک وہی کی رہنمائی کا زمانہ دوسرا عالم طبیعت اور تاریخ میں عقل و فکری رہنمائی کا زمانہ اگرچہ قدیم دنیا میں فلسفے کے چند مکتب (جیسے یونان اور روم) موجود تھے لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں

یہ اور بات ہے کہ اس کی شکل اور خاصیت زندگی کے ارتقاء کے مطلوب کے مطابق مختلف ہوتی ہے وہ گھاس جو کسی جگہ پر اگتی ہے اور آزادی کے ساتھ نشوونما پاتی ہے وہ جانور جو زندگی کے نئے محول سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ایک نئے عضو کا حامل ہوتا ہے اور وہ انسان جو زندگی کی اندر وہی گہرا ہیوں میں ایک نئی روشنی کر لیتا ہے۔ یہ سب کے سب وہی کے مختلف حالات کے نمائندے ہیں جو ہی کو قبول کرنے والی ظرفیت و صلاحیت کی ضرورتوں کے مطابق یا ان نوعی ضرورتوں کے مطابق جن سے وہ ظرف تعلق رکھتا ہے مختلف و گونا گوں شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے۔

(احیاء فکر دینی دراسلام ص ۱۲۳ ۱۲۴)

۲۔ وہی جلی قوت جیسی ایک چیز ہے اور وہی کی ہدایت جلی ہدایت جیسی چیز ہے۔

۳۔ وہی طبیعت انسان کی ہدایت کا نام ہے یعنی انسانی معاشرہ اس اعتبار سے کہ وہ ایک وحدت ہے اور مخصوص راستہ اور حرکت کے قوانین رکھتا ہے اس لئے اس بات کا محتاج ہے کہ اس کی ہدایت کی جائے نبی وہ وصول کرنے والا آلہ (Receiver) ہے جو جلی طور پر اپیغامات کو جن کی احتیاج نوع بشرط ہے حاصل کر لیتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

”حیات جہانی ایک نور کی صورت میں اپنی حاجتوں کو دیکھتی ہے اور ایک بھری لختے میں اپنی سمت کو معین کر لیتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم دین کی زبان میں ”پیغمبر تک وہی کا پہنچنا“ کہتے ہیں۔“ (احیاء فکر دینی دراسلام ص ۱۶۸)

۴۔ تمام جاندار اپنے وجود کی ابتدائی منزلوں میں (جلی قوت کے ذریعے ہدایت پاتے ہیں اور جیسے جیسے ترقی و تکامل کے درجوں میں بلند ہوتے جاتے ہیں اور احساس تخيّل اور سوچنے کی قوت ان کے اندر زیادہ ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے ان کی جلی

ظہور اسلام کے ساتھ خود رسالت کے ختم ہو جانے کی ضرورت آشکار ہو جانے کے نتیجے میں رسالت بھی اپنے حد کمال کو پہنچ جاتی ہے اور یہ چیز خود اس امر کا میں ثبوت ہے کہ زندگی ہمیشہ مرحلہ طفلی اور خارج سے رہبری کی سطح پر نہیں رہ سکتی۔ اسلام میں غیب گوئی اور میراثی حکومت کو غلط اور باطل قرار دینا عقل کی طرف مستقل توجہ اور قرآن سے تجربہ حاصل کرنا اور اس کتاب میں عالم طبیعت اور تاریخ کو انسانی معرفت کے سرچشمے کے عنوان سے جواہیت دی گئی ہے یہ سب دور رسالت کے خاتمے کی مختلف علماتیں ہیں۔“

یہ ہیں علامہ اقبال کی نظر میں فلسفہ نبوت کے ارکان و اصول ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ فلسفہ قابل اعتراض ہے اور اس کے بہت سے اصول غیر صحیح ہیں۔ پہلا اعتراض جو اس فلسفے پر وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس فلسفے کو درست مان لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ مزید کسی وحی اور نبی کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وحی کی رہنمائی کی بھی قطعاً ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ تجرباتی عقل کی ہدایت وحی کی ہدایت کی جگہ لے پچھی ہے۔ اگرچہ یہ فلسفہ صحیح ہو تو پھر یہ فلسفہ دین کے خاتمے کا فلسفہ ہے نہ کہ ختم نبوت کا۔ (اس فلسفے کی رو سے وحی اسلام کا کام صرف یہ اعلان کرنا ہے کہ دین کے دور کا خاتمہ اور عقل و علم کے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ نظریہ نہ صرف اسلام کے ایک ضروری امر کے خلاف ہے بلکہ خود اقبال کے نظریے کا مخالف ہے کیوں کہ اقبال کی تمام تر کوششیں اس امر پر صرف ہوئی ہیں کہ علم و عقل انسانی معاشرے کے لئے لازم ہیں لیکن کافی نہیں ہیں۔ انسان دین اور مذہبی ایمان کا اتنا ہی نیاز مند ہے جتنا سائنس کا۔

علامہ اقبال خود صراحتاً کہتے ہیں کہ زندگی ثابت اصولوں اور بدلتے رہنے والے فرد کی محتاج ہے اور اسلام میں اجتہاد کا کام اصول پر فروع کا منطبق کرنا ہے۔

موصوف کہتے ہیں:

تحتی اور انسانیت ابھی دور طفليت سے گزر رہی تھی علامہ اقبال کہتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم دنیا جس میں انسان موجودہ حالت کے مقابلے میں ابتدائی دور کی زندگی رکھتا تھا اور کم و بیش وہم و تخلی کا تابع تھا اگرچہ اس نے چند فلسفی مکتب قائم کر لئے تھے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ قدیم دنیا میں فلسفی نظریات کا قائم کرنا محض فکر و نظر کا کام تھا کیوں کہ اس وقت تک انسان بہم دینی عقائد اور راجح سنتوں اور طریقوں سے آگئے نہ بڑھ سکا تھا اور زندگی کے عین اور تحقیقی حالات کے بارے میں کوئی قابل اعتماد نظریہ ہمارے لئے مہیا نہیں کر سکا تھا۔“ (احیاء فکر دینی در اسلام ص ۱۲۵)

۔۔۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن پر نبوت کا خاتمہ ہوا کا تعلق دنیاۓ قدیم سے بھی تھا اور دنیاۓ جدید سے بھی۔ اپنے سرچشمہ ہدایت یعنی وحی (نہ کہ طبیعت و تاریخ کے تجرباتی مطالعے) کے لحاظ سے قدیم دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی روحانی تعلیمات کے اعتبار سے یعنی طبیعت و تاریخ کے مطالعے عقل و فکر کی دعوت کے لحاظ سے جس کے پیدا ہونے کے بعد وحی کا کام تمام ہو جاتا ہے جدید دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں:

”پس جب مسئلہ وحی پر اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو کہنا چاہئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم قدیم اور جدید دنیا کے درمیان کھڑے ہیں جہاں تک آنحضرت کا رابطہ الہامی سرچشمے سے ہے تو اس لحاظ سے آپ کا تعلق قدیم دنیا سے ہے اور جہاں تک آپ کی روح ہدایت کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے آپ جدید دنیا سے متعلق ہیں۔ زندگی نے آپ کے اندر معرفت کے نئے سرچشمے آشکار کئے۔ (طبیعت اور تاریخ کے مطالعے کے ذریعے معرفت) جو آج کی جدید روشن زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اسلام اور عقل کا ظہور ایک استقرائی دلیل ہے۔

رہنمائی کی دلائل احتیاج کی بقاء کے سوفی صدحای ہیں لیکن انہوں نے ختم نبوت کے لئے جو فلسفہ بیان کیا ہے اس کا لازم یہ ہے کہ جدید وچی اور جدید رسالت کی احتیاج ہی نہیں بلکہ ہدایت کی بھی احتیاج ختم ہو جائے اور درحقیقت اس فلسفے کی رو سے نہ صرف نبوت کا سلسہ ختم ہوتا ہے بلکہ دین بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ختم نبوت کے بارے میں اقبال کی اشتباہ آمیز توجیہ اس امر کا سبب نی ہے کہ ان کی بحث و گفتگو سے یہ غلط نتیجہ نکالا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ ختم نبوت کا دور یعنی وحی سے انسان کی بے نیازی کا دور آن پہنچا ہے اور انسان کے لئے پیغمبروں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت بچ کے لئے کلاس کے استاد کی مانند ہے۔ جس طرح بچہ ہر سال اوپر والی کلاس میں جاتا ہے تو اس کا استاد بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے اسی طرح انسان بھی مختلف زمانوں سے ہوتا ہوا ایک بالاتر مرحلے میں قدم رکھ چکا ہے اور اس کے لئے قانون و شریعت تبدیل ہو چکی ہے جس طرح بچہ آخری کلاس میں پہنچتا ہے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کا سرٹیفیکیٹ لیتا ہے اور اس کے بعد اپنے بیچ پر اور استاد کی مدد کے بغیر اپنی تحقیقات کو جاری رکھتا ہے اسی طرح انسان نے بھی ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی اپنی تعلیم مکمل کرنے کا سرٹیفیکیٹ لے لیا اور جدید تعلیم کے حصول سے بے نیاز ہو گیا۔ بغیر کسی مدد کے بذات خود طبیعت و تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا اور اجتہاد کا مطلب بھی یہی ہے۔ پس ختم نبوت سے مراد انسان کا خود کفائی تک پہنچنا ہے بلاشبک ختم نبوت کے سلسلے میں اس قسم کی تفسیر غلط ہے۔ ختم نبوت کی اس قسم کی تفاسیر ایسے متانج کی حامل ہیں جونہ تو اقبال کے لئے قابل قبول ہیں اور نہ ہی ان کے لئے جنہوں نے اقبال کی تحریر سے اس قسم کے متانج اخذ کئے ہیں۔

ثانیاً اگر اقبال کا نظریہ درست ہو تو عقل تجربی کے پیدا ہونے کے بعد جس کو اقبال ”درویں تجربے“ کا نام دیتا ہے (اویاء اللہ کے مکاشفات) کا بھی خاتمه ہو جائے

”اس نئی تہذیب و ثقافت (اسلامی ثقافت) نے عالمی وحدت کی بنیاد اصول توحید پر رکھی ہے۔ اسلام نظام حکومت کے عنوان سے اس امر کے لئے ایک عملی ذریعہ ہے بلکہ اصول توحید کو نوع بشری عقلی اور باہمی زندگی میں ایک زندہ عامل و سبب قرار دیتا ہے۔ اسلام خدا کے ساتھ وفادار رہنے کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ عالم اور استبدادی حکومت کے ساتھ وفادار رہنے کا۔ چونکہ خدا ہی پر زندگی کی آخری روحانی بنیاد ہے لہذا خدا سے وفاداری عملاً خود آدمی کی مثالی طبیعت (یعنی خواہش آرزو اور مطلوبہ کمال کی جتنی کوی طبیعت) سے وفاداری ہے۔ وہ معاشرہ جو حقیقت کے ایسے تصور پر قائم ہوا ہو اسے چاہئے کہ اپنی زندگی میں ”ابدیت“ اور ”تغیر“ دونوں مقولوں کے درمیان آپس میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کے واسطے اپنے لئے ابدی اصول رکھتا ہو کیوں کہ جو چیز بھی ابدی اور دلائلی ہے وہ اس دلائلی تغیر پر زیر دنیا میں ہمارے واسطے مستحکم بنیادیں مہیا کرتی ہے لیکن جب ابدی اصولوں کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ وہ ہر تغیر و تبدل کے مخالف ہیں یعنی اس چیز سے معارض ہیں جسے قرآن خدا کی ایک عظیم ترین نشانی قرار دیتا ہے تو اس وقت وہ اس کا سبب بنیں گے کہ جو چیز ذاتاً متحرک ہے اسے حرکت سے روک دیں سیاسی و اجتماعی علوم میں یورپ کی شکست پہلے اصول (یعنی ہر قسم کے ابدی اصول کی نفی اور زندگی کے بنیادی اصول کی ابدیت سے انکار) کو مجسم کر دیتی ہے اور ان آخری پانچ سو (۵۰۰) برسوں میں اسلام کی بے حرکت دوسرے اصول (اصول حرکت و تغیر سے انکار اور ابدیت پر اعتقاد) اسلام میں حرکت کا اصول کیا ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اصول اجتہاد کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔“ (احیائے فکر دینی در اسلام ص ۱۲۹۱۶۸)

مذکورہ بالا بیان کے مطابق وچی کی رہنمائی کی ضرورت ہمیشہ باقی ہے اور تجرباتی عقل کی رہنمائی وچی کی رہنمائی کا بدل نہیں ہو سکتی۔ خود اقبال بھی ہدایت و

کے ساتھ الہامات اور اولیاء اللہ کے مکاشفات و کرامات ختم نہیں ہو گئے ہیں۔ البتہ ان کا گذشتہ اعتبار ختم ہو گیا ہے۔ ماضی میں جب کہ ابھی تجربی عقل پیدا نہیں ہوئی تھی تو معجزہ و کرامت ایک مکمل طبعی اور قبل قبول اور شک و شبہ سے خالی و عاری سند ہوا کرتی تھی لیکن پختہ فکر اور عقلی کمال کے حامل انسان کے واسطے (دور خاتمیت کے انسان کے لئے) یہ امور اب کوئی جست اور سندیت نہیں رکھتے لہذا ہر واقعے کی طرح انہیں بھی عقلانی تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔

خاتمیت سے قبل کا زمانہ معجزہ و کرامات کا زمانہ تھا یعنی معجزہ و کرامات عقل کو اپنے زیر اثر رکھتے تھے لیکن خاتمیت کا زمانہ عقل کا زمانہ ہے۔ عقل کرامت کے مشاہدے کو کسی چیز کی دلیل نہیں مانتی مگر یہ کہ وہ اپنے معیاروں کے ساتھ الہام کے ذریعے کسی کشف شدہ حقیقت کی صحت و اعتبار کو ظاہر کرے اقبال کی گفتگو کا یہ حصہ بھی دور خاتمیت سے پہلے کے لحاظ سے بھی اور دور خاتمیت کے بعد کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے امّا بعد میں معجزے اور خاتمیت کے عنوان سے اس پر روشنی ڈالیں گے۔

ثالثاً یہ کہ علامہ اقبال وحی کو فطری قوت کی ایک قسم سمجھتے ہیں جو غلط ہے اور یہی نظریہ ان کے دیگر اشتباہات کا موجب بنتا ہے فطری قوت یا فطری شعور جس طرح کہ اقبال خود اس طرف متوجہ ہیں ایک سو فیصد طبعی (غیر اکتسابی) نا آگہانہ اور حس و عقل کے مقابلہ میں بہت پست اور معمولی ہے جس کو قانون خلقت نے حیوان (حشرات یا ان سے بھی نچلے درجے کے حیوانات) کے وجود کے ابتدائی مرحلوں میں بھی ودیعت کیا ہے جو بالآخر درجے (حس و عقل) کی ہدایتوں کی رشد و نمو کے ساتھ کمزور پڑ جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے لہذا انسان جو فکری اعتبار سے حیوانات میں سب سے زیادہ بے نیاز ہے فطری شعور کے اعتبار سے حیوانات میں سب سے زیادہ کمزور ہے لیکن اس کے برعکس وحی حس و عقل کی رہنمائی سے بالآخر اور کسی حد تک اکتسابی ہے

کیوں کہ فرض یہ ہے کہ یہ امور ایک قسم کے فطری شعور کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور عقل تجربی کے ساتھ فطری شعور کا مرحلہ ختم ہوتا ہے حالانکہ خود اقبال کی تصریح کے مطابق باطنی تجربہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے اور اسلام کی نظر میں باطنی و اندر ورنی تجربہ معرفت کے تین سرچشمتوں میں سے ایک ہے۔ (بقیہ دوسرے چشمے طبیعت اور تاریخ ہیں) اقبال اپنی شخصی طور پر شدید عرفانی میلان رکھتے ہیں اور معنوی الہامات کے زبردست حامی ہیں وہ کہتے ہیں:

”یہ فکر اس معنی میں نہیں ہے کہ ”باطنی تجربے“ کی کہ جو کیفیت کے لحاظ سے پیغمبر انہ تجربے سے مختلف نہیں ہے حیاتی واقعیت کا جو سلسہ تھا وہ منقطع ہو گیا۔ قرآن ”نفس“ یعنی خود اور ”آفاق“ یعنی جہان (دنیا) کو علم و معرفت کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ خداوند عالم اپنی نشانیوں کو اندر ورنی تجربے میں بھی ظاہر کرتا ہے اور یہ ورنی تجربے میں بھی اور آدمی کا فرض یہ ہے کہ تجربے کی تمام علامتوں کی معرفت کو عدالت کے حضور میں فیصلہ کے لئے رکھے۔ خاتمیت کو اس معنی میں نہیں لینا چاہئے کہ زندگی کی آخری اور حتمی سرنوشت عواطف کی جگہ پر عقل کا کامل جانشین ہو جانا ہے ایسی چیز نہ تو ممکن ہے اور نہ وہ مطلوب ہے۔ اس فکر و نظر کی عاقلانہ قدر و قیمت اس امر میں ہے کہ یہ باطنی تجربے کے مقابلے میں ایک مستقل پر کھنے والی طاقت پیدا کرتی ہے اور یہ امر اس عقیدے سے حاصل ہوتا ہے کہ اشخاص کے مافق الطبیعت سے اتصال کے دعوے کا اعتبار انسانی تاریخ میں ختم ہو چکا ہے اس بناء پر اب باطنی اور عارفانہ تجربے پر چاہیے وہ جتنا بھی غیر معمولی اور غیر معروف ہو ایک مکمل طبعی اور قدرتی تجربے کے زاویے سے نگاہ ڈالی جائے اور انسانی تجربے کی دوسری نشانیوں کی مانند اس کو تقدیدی نظر سے بحث و نظر کا موضوع قرار دیا جائے۔“ (امیاء فکر دینی در اسلام ص ۱۳۶ ۱۳۷)

اقبال کا اپنی گفتگو کے آخری حصے میں مقصود یہ ہے کہ نبوت کے ختم ہو جانے

مراحل اور راستوں سے زیادہ نہیں ہو گا جو آشکار ہو چکے ہیں اور وہ انہی کی پیروی کرنے پر مجبور ہے۔

الخاتم من ختم المراتب باسرها

خاتم وہ شخص ہوتا ہے جس نے تمام مراتب و درجات کو طے کر لیا ہوا اور کسی مرحلے اور منزل کو طے کرنا باتی نہ چھوڑا ہو یہ ہے ختم نبوت کا معیار نہ کہ معاشرے کی عقل تجربی کی پختگی علامہ اقبال اگر ان مددان خدا کے آثار پر غور و فکر کرتے جن کے وہ عقیدت مند ہیں تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وحی فطری شعور نہیں ہے بلکہ وہ ایک روح اور حیات ہے جو عقلانی روح و حیات سے بالاتر و بلند تر ہے۔
مولانا روم کہتے ہیں:

غیر فہم جان کہ در گاو و خراست

آدمی را عقل و جانی دیگر است

”انسان کی عقل اور روح گائے اور گدھے میں موجود فہم اور روح سے مختلف ہے۔“

باز غیر عقل و جان آدمی

ہست جانی در نبی و در ولی

”پھر انسان کی عقل و روح سے مختلف وہ روح ہے جو نبی اور ولی کو عطا ہوتی ہے۔“

جسم ظاہر روح مخفی آمدہ است

جسم ہم چون آستین جان ہم چون دست

”جسم ظاہر ہوتا ہے اور روح مخفی ہوتی ہے جسم آستین کی طرح ظاہر ہوتا ہے

اور وحی کی آگاہی اور علم بدرجہ اولیٰ حس و عقل کی آگاہی اور بصیرت سے بالاتر ہے اور وہ معلومات جو وحی کے ذریعے سے کشف و آشکار ہوتی ہیں عقل تجربی کی معلومات سے بے حد و سبق اور بہت ہی عمیق ہیں۔ ہم (مکتب اور آئینڈ یا لوچی کے حصے میں) یہ ثابت کر چکے ہیں کہ انسان کی تمام انفرادی و اجتماعی صلاحیتوں اجتماعی رابطوں کی پیچیدگیوں اور ارتقائی رفتار کی انہتاً معین نہ ہونے کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ جس چیز کو اجتماعی مفکروں اور فلسفیوں نے آئینڈ یا لوچی کے نام سے پیش کیا ہے وہ گمراہی اور انسان کی شکست کے سوا کچھ نہیں۔ آئینڈ یا لوچی کے لحاظ سے انسان کے لئے ایک راستے سے زیادہ نہیں ہے اور وہ وحی سے حاصل شدہ آئینڈ یا لوچی ہے اور اگر وحی کی آئینڈ یا لوچی نہیں ہے۔

آج کل کے مفکرین یہ یقین رکھتے ہیں کہ بشر کے آئندہ سفر کی راہ معین کرنا انسانی آئینڈ یا لوچی کی شکل میں صرف منزل پر منزل کی شکل میں ممکن ہے یعنی صرف یہی صورت ممکن ہے کہ ہر منزل پر بعد ایمن منزل کی راہ معین کی جائے لیکن جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ اس منزل کے بعد ایمن منزلیں کہاں ہیں اور سب سے آخری منزل کیا اور کہاں ہو گی؟ کچھ نہیں معلوم۔ ایسے اجتماعی نظریوں کا نتیجہ اور انجام بھی معلوم ہے۔

اے کاش علامہ اقبال جو عرفان کے آثار کا کم و بیش مطالعہ کر چکے ہیں اور مولانا روم کی مشنوی سے انہیں خاص طور پر انس ہے ان کتابوں کا ذرا غور سے مطالعہ کرتے تو ختم نبوت کے لئے بہتر سماں یہ تحقیق حاصل کر سکتے۔ عرفان کتنے تک پہنچ گئے ہیں کہ نبوت کا سلسلہ اس حیثیت سے ختم ہوا کہ انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مراحل و منازل اور وہ راستے جس پر انسان کو چلنا چاہئے سب ایک جگہ آشکار ہیں اور اب اس کے بعد انسان آئینڈ یا لوچی کے لحاظ سے جو چیز بھی کشف کرے گا وہ ان

محفوظ ہے وہ خطاء محفوظ ہے۔“

نی نجوم است و نہ رمل است نہ خواب
وہی حق واللہ اعلم بالصواب

”وہی نہ تو علم نجوم سے متعلق ہے نہ علم رمل ہے اور نہ خواب ہے پس وہ حق
تعالیٰ کی وہی ہے اور (اس کے بارے میں) اللہ ہی صحیح علم رکھتا ہے۔“

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ علامہ اقبال اپنے مذکورہ فلسفہ میں اسی طرح اشتباہ
سے دوچار ہوئے ہیں جس طرح سے مغربی دنیا ہوئی ہے یعنی سائنس کو ایمان کا جانشین
ہنانا۔ بلا شک علامہ اقبال سائنس کی جانشینی کے نظریے کے سخت خلاف ہیں لیکن فلسفہ
ختم نبوت میں انہوں نے جو راستہ اپنایا ہے وہ اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے اقبال وہی کی
تعریف فطری قسم کی چیز سے کرتے ہیں اور اس امر کے مدئی ہیں کہ کارخانہ عقش و فکر
کے کام شروع کر دینے کے بعد جبلت اور فطری شعور کا فریضہ انجام کو پہنچ جاتا ہے اور
خود جبلت خاموش ہو جاتی ہے یہ بات صحیح تھی مگر اس صورت میں جب کہ عقل و فکر اسی
کام کو شروع کرتی جس کو طبیعت و جبلت انجام دیتی تھی لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ
جبلت کا فریضہ کچھ اور ہے اور عقل و فکر کا کچھ اور تو پھر اس کی کوئی دلیل نہیں کہ عقل و فکر
کے مشغول کار ہو جانے کے ساتھ ہی جبلت اور فطری شعور کا کام ختم ہو جائے۔

پس اگر بالفرض ہم وہی کو ایک قسم کی جبلت اور فطری شعور سمجھیں اور یہ مان
لیں کہ اس کا کام ایک قسم کا تصور کا نتات اور اجتماعی مسئلک کا پیش کرنا ہے جس کا امکان
عقل و فکر کے ہاں نہیں ہے تو پھر بھی اس امر کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ بقول (خود اقبال)
عقل برہان استقرائی کی پیشگی کے ساتھ ہی جبلت کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال شہرت و بلندی علمی کمال اور اسلام کا در در کھنے

اور روح (آستین کے اندر چھپے ہوئے) ہاتھ کی طرح مخفی ہوتی ہے۔“

باز عقل از روح مخفی تربوز

حس بسوی روح زودتر رہ برد

”پھر عقل ہے جو روح سے بھی زیادہ مخفی ہوتی ہے اور حس (عقل کی بہ
نسبت) روح کا ادراک جلدی کر لیتی ہے۔“

روح وہی از عقل پہنан تو بود

زانکہ او غیب است و او زان سر بود

”پھر وہی کی روح عقل سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے کہ وہ غیبی
چیز ہے اور عقل تو انسان کے سر میں ہوتی ہے۔“

عقل احمد از کسی پہنان نشد

روح و حیث مدرک ہر جان نشد

”احمد مجتبی کی عقل کسی سے پوشیدہ اور مخفی نہیں تھی لیکن آنحضرت کی وہی کی
روح کو ہر شخص نہیں سمجھ سکا۔“

روح وہی را مناسجا است نیز

درنیابد عقل کان آمد عزیز

”وہی کی روح کے لئے کچھ مناسبات اور بھی ہیں لیکن عقل اس کا ادراک
نہیں کر سکتی۔“

لوح محفوظ است و را پیشووا

از چہ محفوظ است؟ محفوظ از خطأ

”لوح محفوظ کے ذریعے اس وہی کی رہنمائی ہوتی ہے لوح محفوظ کس چیز سے

معجزہ ختمی مرتب

قرآن کریم حضرت ختمی مرتب کا ہمیشہ زندہ رہنے والا معجزہ ہے۔ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ حضرت یحییٰ عیسیٰ گذشتہ انبیاء کی اعجاز نمائی کا موضوع، جن کے پاس آسمانی کتاب بھی تھی اور مججزہ بھی، ان کتابوں سے مختلف تھا مثلاً شعلہ و رآگ کا ٹھنڈک اور اسلامیت میں بدل جانا یا خشک لکڑی کا اڑ دھابن جانا یا مردوں کو زندہ کرنا۔ ظاہری بات ہے کہ ان معجزات میں سے ہر ایک وقت و عارضی اور جلد ختم ہو جانے والا تھا، مگر حضرت خاتم الانبیاء کے معجزہ کا موضوع خود حضرت کی لائی ہوئی کتاب ”قرآن مجید“ ہے۔ حضرت کی کتاب ایک ہی وقت میں کتاب بھی ہے اور آپ کی رسالت کی دلیل بھی اور اسی دلیل کی بنیاد پر دیگر معجزات کے برخلاف خاتمیت زندہ جاوید ہے نہ کہ عارضی اور جلد ختم ہو جانے والا۔

حضرت خاتم الانبیاء کے معجزے کا نوع کتاب سے ہونا ایک ایسی چیز ہے، جو آنحضرت کے عصر و زمانے سے جو علم و دانش، تہذیب و تمدن اور علم و معارف کی ترقی اور پیش رفت کا زمانہ ہے، مناسب رکھتی ہے اور یہ ترقی اس بات کا امکان فراہم کرتی ہے کہ اس کتاب کے بہت سے اعجازی پہلو تدریجیاً روشن ہوں، جو پہلے ظاہر نہیں ہوئے تھے، جیسا کہ اس کا جاویدانی ہونا، آپ کے یہی پیغام اور رسالت سے مناسبت رکھتا ہے کہ جو ہمیشہ باقی اور ناقابل نہیں ہے۔

قرآن کریم نے اپنے مجرمانہ اور فوق بشریت پہلو کی خبر اپنی چند آیتوں میں صریحًا دی ہے۔ (مثلاً قرآن کی یہ آیت:

إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأُتُوا

کے باوجود اس لحاظ سے کہ ان کی تہذیب ایک مغربی تہذیب ہے اور اسلامی تہذیب ان کی ثانوی تہذیب ہے یعنی انہوں نے اپنی تمام تعلیم مغربی مضمایں میں حاصل کی ہے اور اسلامی تہذیب میں خاص کرفتنہ و عرفان اور بس تھوڑا بہت فلسفہ کا مطالعہ ہے لہذا بعض بگھے زبردست اشتباہ کا شکار ہوئے ہیں۔ ہم نے ”أصول فلسفہ و روش ریالزم“ کے مقدمہ میں اقبال کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اسی وجہ سے سید جمال الدین اسد آبادی سے ان کا موازنہ کرنا صحیح نہیں ہے ایک تو سید جمال الدین اپنے ذاتی فضل و کمال کے لحاظ سے بھی ایک تدآور اور مضبوط شخصیت ہیں اور اس کے ساتھ ان کی اصلی تعلیم اسلامی تھی اور مغربی تعلیم اور شفاقت ثانوی حیثیت رکھتی تھی اس کے علاوہ مرحوم سید جمال الدین نے اسلامی ملکوں کے دورے کے تھے اور بہت ہی قریب سے ان ملکوں کے سیاسی و اجتماعی حالات کا مطالعہ کیا تھا لیکن اقبال کو یہ سب خصوصیات حاصل نہ تھیں اسی وجہ سے سید جمال الدین اقبال کی طرح بعض اسلامی ممالک (مثلاً ایران اور ترکی) کے واقعات کے سلسلے میں کسی صورت میں بھی اشتباہ کا شکار نہیں ہوئے۔

ہے کہ قرآن نے مشرکین کے ان کی خواہش کے مطابق مجذہ کے مطالبے پر منفی جواب دیا ہے، انہی آیتوں کو بطور سند پیش کرتے ہوئے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میں قرآن کے سوا کوئی دوسرا مجذہ نہیں رکھتا۔ اگر تم قرآن کو بطور مجذہ قبول کرتے ہو تو بہتر ہے ورنہ میرے پاس کوئی دوسرا مجذہ نہیں ہے، بعض ”روشن فکر“ اور اہل قلم مسلمان مورخین نے بھی حال ہی میں اسی نظریے کو قبول کر لیا ہے اور اس کی توجیہ اس شکل سے کی ہے کہ مجذہ قانون کنندہ دلیل ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو فکری اور عقلی لحاظ سے بالغ ورشیدنہ ہوں اور جو اس قسم کے حیرت انگیز امور کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن بالغ ورشید اور پختہ عقل والا انسان اس طرح کے امور کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور اسے تو منطق سے سروکار ہوتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کا منطق و عقل کا دور ہے نہ کہ توهہات اور ذہنی تخلیلات کا (اسی لئے) پیغمبر اسلام ﷺ نے بے اذن خدا قرآن مجید کے علاوہ ہر قسم کے مجذہ کی درخواست قبول کرنے سے انکار فرمایا۔ وہ لوگ کہتے ہیں:

”گذشتہ انبیاء کا مجذہات اور غیر معمولی امور سے مدد لینا لازم و ضروری اور ناگزیر تھا، کیوں کہ اس دور میں ان حضرات کا عقلي دلیلوں کے ذریعے رہنمائی کرنا بے حد دشوار بلکہ حال تھا پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کے زمانے میں انسانی معاشرہ طفلی دور کو بہت پیچھے چھوڑ کر فکری بلوغ کے دور میں قدم رکھ رہا تھا۔ کل تک جو بچا اپنی ماں کا محتاج تھا تاکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنا سیکھ سکے، اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنی عقلی استعمال کر سکتا ہے۔“

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ عمل بغیر دلیل و حکمت نہیں تھا کہ مفکرین و معاندین آپ سے مجذہات پیش کرنے پر اصرار کرتے، لیکن آپ ان کی دعوت کا ثابت جواب نہیں دیتے بلکہ اپنی دعوت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے عقلی و تجرباتی اور تاریخی

بِسُورَةِ مِنْ مَثِيلِهِ

اگر تم لوگ اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے شک و تردید میں بیٹلا ہو تو تم اس جیسی ایک سورہ ہی بنالا و۔ (جیسا کہ قرآن نے اپنے علاوہ خاتم الانبیاء کے دوسرے مجذہات کے واقع ہونے کی تصریح کی ہے۔) (بقرہ / ۲۳)

قرآن کریم میں مجذہات سے متعلق بہت سے مسائل بیان ہوتے ہیں، جیسے پیغمبران الہی کی رسالت کا مجذہ کے ساتھ ہونے کی ضرورت اور یہ کہ مجذہ ”بینہ“ اور دلیل قاطع ہے اور یہ کہ انبیاء و رسول مجذہ کے خدا کے اذن و اجازت سے پیش کرتے ہیں اور یہ کہ پیغمبران خدا اسی حد تک مجذہ پیش کرتے ہیں جو ان کے قول کی صداقت و سچائی کی دلیل و نشانی ہو۔ وہ حضرات اس کے پابند نہیں ہیں کہ لوگوں کی بے سوچی سمجھی خواہشات کی متابعت کریں اور لوگوں کی منشا کے مطابق مجذہات دکھاتے رہیں اور جو شخص جس وقت اور جس روز مجذہ کے مطالبے کرے، اسے فوراً قبول کر لیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پیغمبروں نے مجذہ کی نمائش گاہ قائم نہیں کی ہے اور مجذہ سازی کا کارخانہ نہیں کھول رکھا ہے اور بھی اسی طرح کے مسائل ہیں، جو قرآن میں موجود ہیں۔

قرآن کریم نے جس طرح ان مسائل کو پیش کیا ہے، اسی طرح بہت سے پیغمبران مابین جیسے حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؐ حضرت لوٹؑ حضرت صالحؑ حضرت ہودؑ حضرت موسیؑ اور حضرت عیسیؑ کے مجذہات کو بھی پوری صداقت کے ساتھ نقل کیا ہے اور ان کی صحیت کی گواہی دی ہے، جس کی کسی بھی صورت میں تاویل نہیں ہو سکتی۔

بہت سے مستشرقین اور عیسائی علماء نے ایسی چند آیتوں کو جن کا مفہوم یہ

ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ صرف تمام پیغمبر بلکہ تمام باادشا، تمام طاقت و راور ہر قوم کے حکماء اپنے افکار و اعمال کی توجیہ عجیب و غریب اور غیر معمولی امور سے کرتے رہے ہیں اور اس میں پیغمبروں کا گروہ جن کی رسالت کی بنیاد ہی "غیب" پر رکھی گئی ہے، انہیں دوسروں سے زیادہ ضرورت تھی کہ مجذے سے کام لیں کیوں کہ ان کے زمانے کے لوگوں کے ایمان میں "اعجاز"، منطق و علم اور محسوس و مسلم اور عین حقیقت سے زیادہ کار آمد تھا، لیکن حضرت محمد ﷺ کی بات اس قاعدہ سے مستثنی ہے وہ معاشرہ جس کے ترقی یافتہ اور سب سے بڑے تجارتی شہر میں صرف سات آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور "خاندانی فخر، شمشیر زنی، سرمایہ دولت، اونٹ اور اولاد (وہ بھی لڑکے)" کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں تھے، ایسے معاشرہ میں آپ کتاب کو اپنے مجذے کے طور پیش کرتے ہیں۔ یہ بات خود ایک مجذہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں ایسی کتاب جہاں تاریخ کتاب کے کسی نسخہ کا بھی سراغ نہیں دیتی، اس کا خدا "روشنائی، قلم" اور "تحریر" کی قسم کھاتا ہے، ایسی قوم جو قلم کو چند بحال، عاجز اور بے افتخار افراد کا وسیلہ سمجھتی ہے۔ یہ خود ایک مجذہ ہے، جس کو ہمیشہ دیکھا جاسکتا ہے اور ہر روز اس اعجاز آمیز پہلو کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور یہ وہ تنہا مجذہ ہے، جس کو دوسرے مجذات کے برخلاف غلطمند اور داشمند انسان اور ہر وہ معاشرہ جو زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ متمدن ہو وہ سب اس کے اعجاز کو زیادہ درست، زیادہ صحیح اور زیادہ عینیت پا سکیں گے۔" یہ کتاب وہ اکیلاً مجذہ ہے، جس پر اعتقاد رکھنا صرف امور غیبی ہی کے معتقدین پر مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر مفکر اس کے اعجاز کا مترف ہے۔ یہ وہ تنہا مجذہ ہے، جو نہ صرف عوام کے لئے بلکہ روشن فکروں کے لئے بھی ہے۔ وہ تنہا مجذہ ہے، جو دوسرے مجذات کے برخلاف اپنے دیکھنے والوں میں پائی جانے والی تعجب اور اعجاز کی حس کو بیدار نہیں کرتی، ایک رسالت کو قبول کرنے کے واسطے صرف ایک مقدمہ اور وسیلہ نہیں ہے بلکہ اس پر پقین کرنے اور ایمان لانے والوں کی تعلیم و

شوہد کے ذریعے استدلال کرنے پر زور دیتے ہیں، مفکرین کے اس تمام اصرار وہ ہے دھرمی کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ ایسے مجذات (جیسے انہیاً ماسلف پیش کیا کرتے تھے) پیش کرنے سے بہاذن خدا اجتناب کرتے تھے اور انکار فرمادیتے تھے اور صرف قرآن پر (ایسے مجذے کی حیثیت سے جس کی نظیر نہیں مل سکتی) اکتفا فرماتے تھے۔ حضرت خاتم الانبیاء کا مجذہ قرآن مجید رسالت کی خاتمیت کی بھی دلیل ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالم خلق کے حقائق اور تمام جہات میں مکمل، ہم آنہنگی کے ساتھ زندگی کی تعلیمات اور رہنمائیوں پر مشتمل ہے۔ ایک ایسا مجذہ ہے، جو بالغ ورشید انسان کے لئے مفید ہے نہ کہ اس پیچ کے لئے جو ادھام اور ذہنی تختیلات کا پابند ہو۔" (ڈاکٹر جیب اللہ پاکدار: فلسفہ تاریخ از نظر قرآن، ص ۱۵، ۱۶)

اور بعض کہتے ہیں:

"وہ فضا جس میں گذشتہ انسان سانس لیتا رہا ہے، ہمیشہ خرافات اور موهومات اور خوارق عادات سے بھری رہی ہے اور سوائے اس چیز کے جو عقل و ادراک کے خلاف ہو، اس کے ذہن میں اثر ہی نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ میں بشریت کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ "اعجاز" کی تلاش و جستجو میں مصروف اور "غیب" کی شیفہ اور دلک دادہ رہی ہے۔ یہ حساسیت ہر چیز کے بارے میں جو عقل و شعور میں نہ آنے والی ہو، ان انسانوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، جو تمدن سے زیادہ دور ہوتے ہیں۔

یہ لوگ "طبعیت" سے جتنے زیادہ نزدیک ہیں، اتنے ہی زیادہ "ماوراء طبیعت" کے مشتاق رہتے ہیں اور بے ہو گی اسی حقیقت کی معیوب اولاد ہے، صحرائی انسان ہمیشہ "مجذہ" کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس کی دنیا حیرت انگیز ارواح و اسرار سے بھری ہوئی ہے۔ گذشتہ انسان کی روح فقط اس وقت متاثر ہوتی تھی، جب اس کی نگاہوں کے سامنے کوئی تجہب خیز امر واقع ہو رہا ہو، جس کو وہ رمزوراً سے پر سحر انگیز اور نہیں چیز سمجھتا

کے کہ جو اللہ کو منظور ہو۔ اگر میں غیب کی خبر رکھتا، تو بہت زیادہ نیکیاں کرتا اور کوئی شر
جھے چوبھی نہ سکتا، میں تو ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، فقط ڈرانے والا اور
نوشخبری دینے والا ہوں۔ (سورہ اعراف، ۱۸۸)

لیکن جو پیغمبر غیب دان و غیب گونہ ہوا اور جو روحون، پر یوں اور جنات سے نکنگلوں کے اور روزانہ جس سے کوئی کرامت ظاہرنہ ہو وہ صحرائی لوگوں کی نظر میں کیا تھیقت و اہمیت رکھ سکتا ہے۔ محمد انہیں کائنات کے بارے میں غور و فکر، طہارت، دوستی، علم، وفا اور آدمی کے وجود اور زندگی اور قسمت و انجام کے معنی سمجھنے کی طرف بلا تھے ہیں وروہ لوگ آپ سے پے در پے مجزہ طلب کرتے ہیں اور غیب گوئی اور کرامت کی تواہش کرتے ہیں اور خدا آپ ہی کی زبان سے ایسے لہجے میں کہ گویا ایسے کام کی آپ سے ہر گز ہر گز توقع اور امید نہیں رکھی جاسکتی، فرماتا ہے:

سبحان ربی هل كنت الابشر ارسولا (ڈاکٹر علی شریعتی، اسلام شناسی، ۵۰۲-۵۰۳)

سبحان اللہ کیا میں ایک بھیجے ہوئے بشر کے سوا (کچھ اور) ہوں۔ اس کروہ نے جن زیادہ تر آیات کو بطور سنداختیار ہے۔ وہ سورہ اسراء کی آیات ۹۰-۹۳ میں، جن میں ارشاد خداوندی ہے:

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجِرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوْعًا ④
شَكُونَ لَكَ جَنَّةً مِنْ تُحِيلٍ وَعِنْبٍ فَتَفْجِرَ الْأَنْهَرَ خَلْلَهَا
تَفْجِيرًا ⑤ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ تَأْتِي
بِاللَّهِ وَالْمَلِكَ قَبِيلًا ⑥ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْثُرٌ مِنْ رُخْرُفٍ أَوْ تَرْفِي
فِي السَّمَاءِ ۖ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيقِكَ حَتَّى تُزَرِّلَ عَلَيْنَا كِتَبًا نَقْرُوْةً ۗ

تریتیت کے لئے ہے۔ یہ خود قبول کرنے کا مقصد ہے، خود رسالت ہے اور بالآخر حضرت محمد ﷺ کا یہ مجزہ غیر بشری امور سے نہیں ہے اگرچہ ایک غیر بشری عمل ہے اور اس لحاظ سے گذشتہ انبیاء کے مجذبات کے برخلاف جو لوگوں کے یقین کرنے کے واسطے صرف ایک عامل و سبب کے طور پر کام میں لائے جاتے رہے (وہ بھی چند گنے پچھے افراد کے لئے جو انہیں دیکھتے تھے) اور اس کے علاوہ ان مجذبات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

محمد کا مجرہ بلند ترین انسانی استعداد و صلاحیت کی نوع سے ہے اور انسان کے لئے بلند ترین نمونہ کار اور دستور العمل کے طور پر کام کر سکتا ہے۔ ایسا دستور العمل جو ہمیشہ اس کے قبضہ اختیار میں ہے۔ محمد اکوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کی تلاش و جستجو کا رخ غیر عادی امور، کرامات اور خوارق عادات سے موڑ کر عقلی و منطقی علمی و طبیعی اور اجتماعی و اخلاقی مسائل کی طرف موڑ دیں اور ”عجب و غرائب“ کے سلسلے میں ان کی حسابت کو ہٹا کر ”واقعات و حقائق“ کی طرف موڑ دیں اور یہ کوشش کوئی معمولی چیز نہیں ہے وہ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ جو غیر طبیعی چیزوں کے سوا کسی چیز کے سامنے جھکنا اور کسی کو مانا جانتے ہی نہیں، پھر مزید برآں ایسے شخص کے ذریعے جو اپنے آپ کو ان کے درمیان پیغیر کرتا ہے۔ اپنے کو پیغیر بتانا اور لوگوں کو اپنی خدائی رسالت کی طرف دعوت دینا اور عین اسی حالت میں باقاعدہ طور پر یہ اعتراف کرنا کہ میں ”غیب کی خبر نہیں رکھتا“ تجھ میں ڈال دینے والا کام ہے اور آپ کی انسانی قدر و منزلت کے علاوہ جو چیز بہت زیادہ جذبات کو اباھارتی ہے، وہ آپ کی غیر معمولی سچائی ہے، جس کا احساس آپ کے کام میں ہوتا ہے اور جو ہر دل کو تقدیس کے لئے اور ہر فکر کو تعظیم اور تحسین و تعریف پر آمادہ کرتا ہے۔

آپ سے پوچھتے ہیں، اگر آپ پیغمبر ہیں تو مال تجارت کا نزد (بازار کے بھاؤ) ہمیں بتا دیں تاکہ ہم اپنی تجارت میں نفع حاصل کر سکیں، قرآن آپ کو حکم دیتا ہے کہ تم کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لئے نہ نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا، سوائے اس

۲۔ مججزہ ہونے کی قدر و قیمت اور افادیت کتنی ہے؟ آیا مججزہ اور خارق عادت کا تعلق ایسی چیز سے تھا، جو انسان کے عہد طفیل کے دور سے جب کہ عقل و منطق کا آمد نہیں تھی، مناسبت رکھتی تھی اور ہر شخص یہاں تک کہ کئی بادشاہ ان امور کے ذریعے اپنے اعمال و کردار کی توجیہ کرتے رہے ہیں۔ پیغمبر ان خدا بھی مجبوتر تھے کہ انہیں امور کے ذریعے اپنی تعلیمات حقہ کی توجیہ کریں اور لوگوں کو مطمئن کریں۔ پیغمبر اسلام ﷺ جن کا مججزہ کتاب ہے، اس قaudہ سے مستثنی ہیں۔ آنحضرت نے کتاب اور درحقیقت عمل و منطق کے ذریعے اپنے کو پہنچوایا۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْنِ هُلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا أَرْسُوْلًا ﴿٤﴾

”وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کی تقدیم نہیں کریں گے، جب تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری نہ کر دیں یا آپ کے پاس خرما اور انگور کا کوئی باغ نہ ہو، جس میں آپ نہریں جاری کر دیں یا جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں، ہمارے اوپر آسمان کا کوئی ٹکڑا نہ گردائیں یا خدا اور ملائکہ کو ہمارے رو برو حاضرنہ کر دیں یا آپ کے پاس سونے کا گھرنہ ہو یا آپ آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور آپ کے آسمان پر پہنچ جانے پر ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک کہ آپ ہم پر آسمان سے کوئی خطنه نازل کر دیں، جس کو ہم پڑھیں۔ اے رسول آپ ان کو کہہ دیجیے کہ پاک و منزل ہے میرا پور و دگار، کیا میں ایک بھی ہوئے بشر کے علاوہ (کچھ اور) ہوں۔“

یہ لوگ (بعض روشن فکر مسلمان مورخین) کہتے ہیں کہ یہ آیتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مشرکین پیغمبر سے قرآن کے علاوہ کوئی اور مججزہ چاہتے تھے اور پیغمبر ایسا مججزہ پیش کرنے سے اجتناب اور انکار کرتے تھے۔ اوپر جن مطالب کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض کی خاص کر جو مطالب دوسرا مججزات کی بہ نسبت قرآن کے مججزہ ہونے کی خصوصیت کو جاگر کرتے ہیں، تائید کرتے ہوئے افسوس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان تمام نظریات کی تائید نہیں کر سکتے۔ ہماری نظر میں جو مسائل قابل بحث ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس قرآن مجید کے علاوہ کوئی دوسرا مججزہ نہیں تھا اور قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا مججزہ طلب کرنے والوں کے اصرار کے باوجود ان کی بات کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اسراء کی آیات اس امر کی دلیل ہیں۔

قسم کی آیتیں جو بطور سند پیش کی جاتی ہیں، ان کا قصہ دوسری نوعیت کا ہے، وہاں ”آیت“، ”نشانی“ اور ”بینہ“ (دلیل) کے معنی میں مجزہ طلب کرنے کا مسئلہ ان لوگوں کی طرف سے نہیں ہے، جو واقعہ تردی کی حالت میں ہوں اور ثبوت کے لئے دلیل و برہان کے خواہش مند ہوں۔ یہ آیتیں اور سورہ عکبوتوں کی آیت نمبر ۵۰ (اس آیت پر بعد میں گفتگو کی جائے گی) مشرکوں کی خاص منطق کو مجزہ خواہی میں اور قرآن کی خاص منطق کو پیغمبروں کے مجزے کے فلسفے میں ظاہر و روشن کرتی ہیں۔

سورہ اسراء کی آیات ۹۰ - ۹۳ میں مشرکوں کی بات اس طرح شروع ہوتی ہے:

لَنْ تُؤْمِنَ لَكَ — حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا — يعنی ہم آپ کے فائدے کے لئے آپ پر ایمان نہیں لائیں گے اور آپ کے گروہ میں شامل نہیں ہوں گے، مگر یہ کہ آپ ہمارے فائدے کے لئے ہمارے سامنے اس خشک و سنگاخ زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں (یعنی ایک طرح کا لین دین) یاد رشتہ سے بھرا ہوا گھر رکھتے ہوں، جس سے ہم کے یخچ نہیں بہہ رہی ہوں یا آپ سونے سے بھرا ہوا گھر رکھتے ہوں، جس سے ہم بھی فائدہ حاصل کر سکیں یا آپ آسمان کا ایک ٹکڑا (جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ایسا ہو گا) ہمارے اوپر گردادیں (یعنی عذاب اور رقت اور انعام کا رنہ کہ مجزہ) یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے حاضر کریں یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہمارے واسطے اور ہمارے نام اور فخر کے واسطے خصوصی خط بھیجیں (یہاں بھی ایک طرح کا لین دین کیا جا رہا ہے البتہ روپے پیسے کے ذریعے نہیں بلکہ فخر و مبارات کے عنوان سے، وہ بھی موضوع کے محال ہونے کی طرف توجہ کئے بغیر)۔

بشرکین نے یہ نہیں کہا کہ لن نومن لک — جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ جب تک فلاں مجزہ پیش نہیں کریں گے، ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے بلکہ انہوں

غیر قرآنی مججزہ

کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے سوا کوئی مججزہ نہیں رکھتے تھے؟ یہ مسئلہ جہاں تاریخ و سنت حدیث متواتر کے لحاظ سے ناقابل قبول ہے، وہاں نص قرآن کے بھی خلاف ہے۔ مججزہ شق القمر کا ذکر ہے خود قرآن میں آیا ہے۔ بالفرض اگر کوئی چاند کے دو گلڑے ہونے کی توجیہ و تاویل کرے (اگرچہ اس واقعہ کی تاویل نہیں کی جاسکتی) تو مراجع کے واقعہ اور سورہ اسراء کی توجیہ و تفسیر کیوں کر کی جاسکتی ہے۔ قرآن صاف صاف لفظوں میں کہتا ہے:

سُبْحَنَ اللَّهِ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي لَمْ يُنْذَلْ كُنَّا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ أَيْتَنَا
”پاک و بے نیاز ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصی (بیت المقدس) تک لے گئی، جس کے گرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔“

کیا یہ واقعہ ایک امر خارق عادت اور مججزہ نہیں ہے۔ سورہ مبارکہ تحریم میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک راز کی بات اپنی بیوی سے کہنا اور پھر اس بیوی کا اس راز کو حضرت کی ایک دوسری بیوی سے کہہ دینے (۱) کے قصے میں آیا ہے کہ پیغمبر نے اس بیوی سے کہا کہ تو نے وہ راز دوسری بیوی سے کیوں کہا؟ پھر ان دونوں بیویوں کے درمیان جو باقی ہوئی تھیں، ان کو حضرت نے دھرا دیا، تو اس بیوی نے تعجب سے پوچھا کہ آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ رسول اکرم نے فرمایا، مجھے میرے خدا نے آگاہ کر دیا۔ کیا یہ غیب کی خبر نہیں ہے؟ مججزہ نہیں ہے؟ سورہ اسراء کی آیات نمبر ۹۰ - ۹۳ اور بعض دوسری اس

اس طرف سے وابستہ ہے نہ کہ اس طرف سے۔ جس طرح وچی پیغمبر ﷺ کی خواہش کے تالع نہیں ہے بلکہ اس طرف سے ایک فیضان ہوتا ہے، جو پیغمبر ﷺ کو اپنے زیر اثر کر لیتا ہے، اسی طرح مجذہ بھی اس طرف سے ایک فیضان ہے، جو پیغمبر کے ارادے کو اپنے زیر اثر کر لیتا ہے اور پیغمبر کے ذریعے سے جاری ہوتا ہے۔

اور وچی باذن اللہ ہونے کا مطلب بھی یہی ہے اور مجذہ بھی اذن خدا سے ظاہر ہوتا ہے اور سورۃ عنكبوت کی آیت نمبر ۵۰ کا بھی یہی مطلب ہے، جس سے راہب اور علمائے مسیحی غلط فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

إِنَّمَا الْأُذْيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا آتَانَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ^{۱۰}

”نشانیاں اور مجذرات تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔“

مجذے کے عنوان سے غیب کی خبر دینا بھی ایسا ہی ہے، یہ امر جہاں تک پیغمبر ﷺ کی ذات و شخصیت سے متعلق ہے، آپ اغیب سے بے خبر ہیں۔ قل لا اقول لكم انى ملك ولا اعلم الغيب (سورہ انعام، آیت ۵۰) (اے رسول ۱۱) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں اور مجھے غیب کا علم بھی نہیں، لیکن جہاں پر پیغمبر غیب اور ماورائے طبیعت کے زیر اثر ہوتے ہیں، وہاں پوشیدہ رازوں کی خبر دیتے ہیں اور جب آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ نے کہاں سے اور کیسے جانا تو فرماتے ہیں کہ خداۓ علیم و خبیر نے مجھے خبر دی ہے۔ اگر پیغمبر یہ فرماتے ہیں کہ میں غیب نہیں جانتا اور اگر میں غیب دان ہوتا، تو بہت سی دولت اس کے ذریعے سے حاصل کر لیتا۔

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَا سَتَكُرْتُ مِنَ الْخَيْرِ^{۱۱} (سورہ اعراف،

نے کہا تھا کہ لن نومن لک جس کے معنی یہ ہیں، ہم آپ کے فائدے کے لئے ایمان نہیں لائیں گے اور آپ کے گروہ میں شامل نہیں ہوں گے، یعنی ایک مصلحت آمیز تصدیق، عقیدے کی خرید و فروخت۔ آمن بہ اور آمن لہ میں فرق ہے، علمائے اصول فقہ نے سورہ توبہ کی آیت کی آیت نمبر ۲۱ جس میں رسول خدا ﷺ کے بارے میں ہے کہ یومن بالله و یومن للہومنین سے اسی لطیف و باریک نکتے کو اخذ کیا ہے۔ مشرکین نے اس تصدیق اور مصلحت آمیز تائید کے مقابلہ میں جن چیزوں کو طلب کیا تھا، ان کے علاوہ ایک مطالبہ تقدیر نامن الارض یہو عما کا تھا یعنی آپ ہمارے فائدے کے لئے ایک چشمہ جاری کر دیں۔ ظاہری بات ہے کہ یہ اجرت طلب کرنا ہے نہ کہ دلیل اور مجذہ طلب کرنا۔

پیغمبر ﷺ کی غرض بعثت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو حقیقی معنی میں مومن بنائیں نہ یہ کہ مجذے کی قیمت کے عوض لوگوں کا عقیدہ خریدیں، خود مولف محترم (ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم) یہ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ پیغمبر سے کہتے تھے اگر آپ پیغمبر ہیں تو منڈی کا بھاؤ ہمیں پہلے سے بتا دیا کریں تاکہ ہم اپنی تجارت میں نفع حاصل کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذہ اور دلیل طلب کرنا کشف حقیقت کے لئے نہیں تھا بلکہ پیغمبر کو روپیہ حاصل کرنے کا وسیلہ بنانا تھا۔ ظاہری بات ہے پیغمبر کا جواب یہی ہو گا کہ اگر مجھے ایسی باتوں کے لئے غیب سے آگاہ کیا ہوتا، تو میں اس غیب دانی کو خود اپنے دنیوی کاموں کے لئے وسیلہ بناتا، لیکن مجذہ اور غیب دانی ان کاموں کا وسیلہ نہیں ہے۔ میں پیغمبر ہوں، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ مشرکین یہ گمان کرتے تھے کہ مجذہ ایسی چیز ہے، جو پیغمبر کے اختیار میں ہے، وہ جس وقت چاہیں، جہاں چاہیں اور جس مقصد کے لئے چاہیں، مجذہ دکھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ آپ سے چشمہ جاری کرنے سونے کا گھر رکھنے، پہلے سے قیمتوں کی خرد بینے کا مطالبہ کرتے تھے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مجذہ خودوی کی مانند ہے،

تھے؟ آیا ممکن ہے، کہ ایسا صریح تناقض قرآن مجید میں پایا جائے؟ آیا ممکن ہے، کہ مشرکین ایسے تناقض کی طرف متوجہ ہوئے ہوں؟
 اگر وشن فلکری کی یہ منطق صحیح ہو، تو پیغمبر کو بجائے اس کے کہ سجان اللہ علیہ السلام میں ایک بشر سے زیادہ نہیں ہوں یہ فرمانا چاہئے تھا کہ سجان اللہ علیہ السلام میں خاتم الرسل ہوں، میں دوسرے پیغمبروں کے قاعدے سے مستثنی ہوں، مجھ سے ان باتوں کا مطالبہ نہ کرو، جن کا مطالبہ گذشتہ پیغمبروں سے ان کی امت والے کیا کرتے تھے، نہ یہ کہ یہ فرمائیں کہ میں بھی ایک رسول ہوں، تمام رسولوں کی طرح۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین جو چیز پیغمبر سے طلب کرتے تھے، وہ مجھے یعنی حقیقت کو معلوم اور یقین حاصل کرنے کی غرض سے ”آیت“ و ”بینہ“، ”نشانی و دلیل“، حقیقت کی تلاش کرنے والوں کو جس کا حق حاصل تھا کہ اس کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے سے طلب کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ایسی چیز تھی، جو عام طور سے پیغمبروں کی شان کے خلاف تھی کہ ایسی درخواستوں کو قبول کریں یہی وجہ ہے جس کی بناء پر پیغمبر نے فرمایا کہ سجان اللہ علیہ السلام پر حیثیت ایک بشر اور رسول سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

یعنی جو چیز تم مجھ سے چاہتے ہو وہ ایسی چیز نہیں ہے، جسے ایک حقیقت کی جستجو کرنے والا رسولوں اور پیغمبروں سے طلب کرے اور رسولوں پر اس کا ثابت جواب دینا لازم ہو، یہ تو ایک دوسری چیز ہے، یہ ایک قرارداد اور معاملہ ہے، یہ صرف مجھے دیکھنا اور خدا کو نہ دیکھنا ہے اور (خدا سے غافل اور بے نیاز ہو کر) مستقلًا مجھ سے کچھ مانگنا ہے، یہ اظہار تکبیر اور خودخواہی اور دوسروں کے مقابلے میں اپنے واسطے امتیاز ثابت کرنا ہے، یہ امورِ محال کے ایک سلسلہ کا تقاضا ہے اور مجھے اس امر کا اعتراض ہے کہ عوام کی خواہش اور ان کا میلان ہمیشہ مجھہ سازی کی طرف ہوتا ہے، نہ صرف پیغمبروں اور اماموں کے واسطے بلکہ ہر قبر، ہر پتھر اور ہر درخت کے واسطے، لیکن

آیت ۱۸۸) اس بات سے حضرت رسول خدا علیہ السلام مشرکوں کی بات کا منہ توڑ جواب دینا چاہتے تھے کہ میرا غیب جانا مجھے کی حد میں ہے اور ایک خاص مقصد اور وحی الہی کے وسیلے سے ہے۔ اگر میرا غیب دانی میرے اپنے اختیار میں ہوتی اور اسے ہر مقصد کے واسطے کام میں لایا جا سکتا اور اس کے وسیلے سے جیسیں بھرنا ممکن ہوتا، تو بجائے اس کے کہ تمہیں منڈی کے بھاؤ کے متعلق پیشگی خبر دیتا، خود میں اپنی جیب بھرتا۔ قرآن مجید میں ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا ﴿١﴾ إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِنْ رَّسُولٍ

”خداؤند عالم عالم غیب کا جانے والا ہے، وہ کسی کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا، سوائے اس رسول کے جس کو اس کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔“ (سورہ جن، آیات ۲۶، ۲۷)

یقیناً رسول اکرم ان رسولوں میں سے ایک ہیں، جنہیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر قرآن نے اپنی بہت سی آیات میں پیغمبروں کے مجھرات کو بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مجھرات، حضرت موسیؑ اور حضرت عیسیؑ کے مجھرات، اس صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام علیہ السلام سے لوگ مجھہ کے طالب ہوں، جیسا کہ گذشتہ پیغمبروں سے لوگ مجھہ دکھانے پر اصرار کرتے تھے اور وہ پیغمبر ان کی بات قبول بھی کرتے اور مجھہ دکھادیا کرتے تھے، تو پیغمبر فرمائیں سجان اللہ! میں ایک بھیجے ہوئے بشر سے زیادہ کچھ نہیں ہوں، کیا وہ لوگ (مشرکین) یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتے تھے کہ آیا وہ سب گذشتہ انبیاء، جن کے مجھرات خود آپ نہایت آب و تاب کے ساتھ نقل کرتے ہیں، بشر نہیں تھے، یا پیغمبر نہ

مجزہ کی قدر و قیمت اور افادیت

مجزے کی قدر و قیمت اور افادیت کتنی ہے؟ علمائے منطق و فلسفے نے ان مطالب کو جو کسی استدلال کے موقع پر کام میں لائے جاتے ہیں، ان کی قدر و قیمت کے لحاظ سے چند قسموں میں تقسیم کیا ہے، ان عناصر میں سے بعض برہانی اور استدلالی اہمیت رکھتے ہیں اور علمی و عقلی تردید کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتے، جیسے وہ عناصر جنہیں ایک ریاضی دان اپنے استدلال کے لئے استعمال کرتا ہے اور بعض کا تعلق صرف قانون کر دینے کی حد تک ہوتا ہے، جیسے وہ عناصر اور مواد جنہیں مقررین و خطبائی اپنی تقاریر میں استعمال کرتے ہیں اور جن کی اگر موشگانی کی جائے تو بسا اوقات وہ استدلال صحیح نہیں ہوتا لیکن اگر ان میں وقت نہ کی جائے تو عملاً ایک حرکت و بیداری پیدا کرتے ہیں، بعض اجزاء و عناصر میں صرف جذباتی کیفیت ہوتی ہے، اور وہ صرف جذبات کو ابھارنے کا کام دیتے ہیں اور بعض عناصر دوسرا کیفیتوں اور اہمیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔

مجزوں کی اہمیت و افادیت قرآن کی نظر میں

قرآن مجید جس طرح آثار خلقت کو ”خدا کی نشانیاں“ اور خدا کے وجود کی ناقابل تردید قطعی دلیل سمجھتا ہے، اسی طرح انبیاء کے مجزوں کو بھی کھلی ہوئی نشانیوں کے عنوان سے بیان کرتا ہے اور انہیں ان کے پیش کرنے والوں (انبیاء) کے دعووں کی سچائی پر دلیل قاطع اور عقلی و مطلقی جہت شمار کرتا ہے۔

قرآن نے مجزے کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور پیغمبروں سے ان لوگوں کی طرف سے مجزہ طلب کرنے کو جو بغیر دلیل و شہادت کے (دعائے

کیا یہ وجہ اس امر کا سبب ہو جائے گی، کہ ہم پیغمبر کے لئے (سوائے قرآن کے) ہر مجزہ و کرامت کو غیر ممکن سمجھ لیں؟ اس کے علاوہ مجزوں اور کرامات کے درمیان فرق ہے، مجزہ یعنی الہی دلیل و نشانی جو خدا کی طرف سے مامور ہونے کو ثابت کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے اور دوسرے الفاظ میں اس چیز کے ساتھ ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس کی مثل لاسکتا ہو، تو لائے اس کے لئے کوئی الہی مقصد ضروری ہے، اس لئے وہ چند شرطوں کے ساتھ مخصوص ہے اور کرامت بھی ایک غیر معمولی امر ہے، جو صرف اثر و نتیجہ ہوتا ہے، اس روحانی قوت اور نفس کی پاکیزگی کا جو کسی انسان کامل پاہنام کامل میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کسی الہی مقصد کے اثبات کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ایسے امور (جنہیں کرامت کہا جاتا ہے اور کرامت کی تعریف میں آتے ہیں) بہت زیادہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک معنوں کے مطابق فعل ہے اور کسی شرط سے مشروط نہیں ہے۔ مجزہ خدا کی زبان ہے، جو کسی شخص کی تائید کرتی ہے، لیکن کرامت ایسی زبان نہیں ہے۔

طرف اور ماورائے طبیعت سے طبیعت کی طرف رہنمائی کرے؟ کیا حضرت محمد ﷺ کی یہ کوشش تھی کہ لوگوں کی تلاش و جستجو کا رخ غیر عادی امور اور کرامات و خوارق عادات کی طرف سے عقلیٰ منطقی، علمیٰ طبیعی، اجتماعی و اخلاقی امور کی طرف موڑ دیں اور عجیب و غریب امور کے سلسلے میں ان کی دلچسپی کو واقعات و حقائق کی طرف موڑ دیں۔

ظاہراً معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نظریہ صحیح ہوا اور اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ تمام انبیاء غیب کی طرف دعوت دیتے تھے اور محمد محسوس اور ظاہری چیزوں کی طرف دعوت دیتے تھے لیکن پھر قرآن کریم کی سینکڑوں آیتوں انہیں ”عجیب و غریب امور“ کے ساتھ کیوں مخصوص کی گئی ہیں، بے شک قرآن کا ایک بنیادی امتیاز آیات الہی ہونے کے اعتبار سے عالم شہادت و طبیعت کے مطالعے کی دعوت دینا بھی ہے، لیکن طبیعت کے مطالعے کی دعوت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ذہنوں کو ہر غیر طبیعی امر کی طرف سے موڑ دیا جائے بلکہ اس کے بر عکس آیات اور نشانیوں کی حیثیت سے طبیعت کے مطالعے کی دعوت دینا طبیعت سے ماورائے طبیعت کی طرف عبور کرنے کے معنی میں ہے۔ قرآن کی نظر میں غیب کا راستہ عالم شہود سے، ماورائے طبیعت کا راستہ طبیعت سے اور معقولات کا راستہ محسوسات سے ہو کر گزرتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے کام کی اہمیت اس میں ہے کہ جس طرح آپ طبیعت، تاریخ اور معاشرے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور ان لوگوں کو جو غیر طبیعی امور کے سوا کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے، عقل و منطق اور علم کے ذریعے دین کا تابع و مطیع بناتے ہیں۔ اسی طرح آپ کوشش کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی قوت فکر کو بھی جو عقل و منطق کا دم بھرتے ہیں اور عقلیٰ طبیعی و محسوس چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو نہیں مانتے ایک برتر و بلندر منطق سے آشنا کریں۔ اس دنیا و مافیا کے متعلق جو نظریہ عمومی طور پر مذہب

نبوت) کی تصدیق کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، معقول و منطقی قرار دیا ہے اور پیغمبروں کی طرف سے نشانی اور دلیل طلب کرنے کی حد میں (یعنی ایسی معقول اور منطقی حد میں جوان کی سچائی کی دلیل ہوئے کہ ان لوگوں کی خواہشات کی حد میں کہ جو پیغمبروں سے نفع کمانے یا خود کو مصروف رکھنے یا تماشا دیکھنے کی غرض سے مجرہ طلب کرتے تھے)، ثابت اور عملی جواب کو بڑے خوبصورت انداز میں نقل کیا ہے اور بہت سی آیتوں کو اس کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ قرآن مجید نے اس امر کی طرف معمولی ساشارہ بھی نہیں کیا ہے کہ مجرہ صرف ان سادہ لوح، معمولی اور عامیانہ ذہنوں کے لئے (جو بشر کے دور طفیل سے مناسبت رکھتے ہیں) قانون اور مطمئن کرنے والی دلیل ہے بلکہ مجرہ کو برہان کا نام دیا ہے۔

(ملاحظہ فرمائیں تفسیر لمیٹر ان، سورہ بقرہ کی آیت ۲۳ کے ذیل میں اور کتاب وہی نبوت از آقا تے تقی شریعت، ص ۲۱۳)

پیغمبر ﷺ کی ہدایت کا رخ

م مجرہ خاتمیت اس لحاظ سے کہ کتاب ہے اور قول و بیان و علم و زبان کی صنف سے ہے، ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اس کتاب ابجاز کے گوشے تدریسجاً اور آہستہ آہستہ زیادہ روشن ہوتے جاتے ہیں، آج قرآن مجید کے بہت سے تجھب خیز امور ہمارے زمانے کے لوگوں پر ظاہر اور واضح ہوئے ہیں، جو اس سے پہلے ظاہر نہیں تھے اور یہ بات کل تک ممکن بھی نہیں تھی، قرآن مجید کو دانش و رطبیۃ عام لوگوں سے بہتر سمجھتا ہے۔ اسی لحاظ سے حضرت رسول خدا ﷺ کا مجرہ کتاب کی نوع سے قرار دیا گیا ہے تا کہ یہ دور خاتمیت سے مناسب رکھتا ہو، لیکن کیا یہ مجرہ اس لحاظ سے کتاب کی نوع سے قرار دیا ہے کہ ضمناً انسان کو غیب و شہود کی طرف، نامعقول سے عقلیٰ و منطقی امور کی

تفسیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے ایک یہ کہ محمد کا مجھہ (قرآن) اس بناء پر کہ وچی ہے نہ کہ خود آنحضرت کا قول پس ایک غیر بشری عمل ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جہاں وہ قول بشری نہیں ہے بلکہ قول خدا ہے، وہاں امور بشری سے بھی ہے اور ایک ایسا عادی کام ہے، جو بشری کاموں کے مترادف ہے، میرے خیال میں یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ جملہ کا مطلب یہ ہو (جو بیان کیا گیا) کیوں کہ اس صورت میں قرآن کو دوسرا آسمانی کتابوں کے مقابلے میں کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، اس وجہ سے کہ وہ تمام کتابوں میں مبداءے وچی سے صادر ہوئی ہیں، لہذا غیر بشری فعل ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ کوئی غیر معمولی پہلو نہیں رکھتیں غیر بشری امور سے نہیں ہیں، جیسا کہ ہمارے پاس کچھ ایسے کلمات ہیں، جو احادیث قدسیہ کے نام سے مشہور ہیں اور عین وہ بھی کلام خدا ہیں، جو وچی والہام کئے گئے ہیں، لیکن ان کا تعلق غیر بشری امور سے نہیں ہے۔

قرآن مجید کو تمام آسمانی کتابوں اور احادیث قدسیہ پر جو امتیاز حاصل ہے، وہ اسی وجہ سے ہے کہ یہ ایک غیر بشری امر بھی ہے، یعنی وچی ہے اور غیر بشری امور سے بھی ہے، یعنی اعجاز اور قدرت ما فوق البشر کی حد میں ہے، اسی لئے قرآن کہتا ہے:

قُلْ لَّئِنِ الْجَمَعَيْتِ الْإِلْسُونُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوْنَ بِمِثْلِ هَذَا
الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَا كَانَ بَعْضُهُمْ لَبَعْضٍ ظَهِيرًا

”اے رسول کہہ دو اگر تمام جن و انس اس بات کے لئے جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں، تو وہ اس کی مثل نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مدگار اور پشت پناہ بھی ہوں۔“ (سورہ اسراء، آیت ۸۸)

اس جملے کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا مجھہ سبقہ تمام انبیاء کے معجزات جیسے عصا کو اڑھا بنا دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا کہ جن کا تعلق بشری فعل

اور بالخصوص اسلام پیش کرتا ہے، اس کو ان نظریات کے مقابلے میں جس کو انسانی علوم اور خالص فلسفے پیش کرتے ہیں، جو بنیادی امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ بقول ولیم جیمز مذہبی نظریات میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں، جو مادی عناصر کے علاوہ ہیں اور ان میں ایسے قوانین بھی موجود ہیں، جو انسانی معاشرے کے جانے پہچانے قوانین سے مختلف ہیں، قرآن نہیں چاہتا کہ طبیعت و محسوسات کی طرف توجہ کو مادرائے طبیعت اور غیر محسوس امور کا جائش بنا دے۔ قرآن کی اہمیت اسی میں ہے کہ کائناتی مطالعے کی طرف خاص توجہ کے باوجود (جسے قرآن میں ”شهادت“ سے تعبیر کیا گیا ہے) غیب پر ایمان لانے کو اپنی دعوت میں سرفہرست قرار دیا ہے۔

اللَّهُ ۖ ذَلِكَ الْكِتَبُ لَا رَبَّ يَرِيدُ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۖ اللَّهُمَّ إِنَّ

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (سورہ بقرہ، آیت ۱۳)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن ان امور سے لوگوں کو مختصر کرنے کی فکر میں ہو، جب کہ وہ خود بھی ”عجیب و غریب امور“ سے ہے یعنی مجھہ ہے، اس کے علاوہ اس نے ایک سو سے زیادہ آیات ”انہی عجیب و غریب امور“ سے متعلق پیش کی ہیں، میری سمجھ میں اس جملے کے معنی نہیں آتے کہ کتاب خدا وہ واحد و تہام مجھہ ہے، جس کا اعتقاد محض امور غیبی کے معتقدین پر مختص نہیں ہے، کیا اور کیسا اعتقاد؟ کیا یہ اعتقاد کہ یہ ایک کتاب ہے؟ اور بہترین مطالب پر مشتمل ہے؟ یا یہ عقیدہ کہ مجھہ ہے؟ کسی چیز کے الہی دلیل ہونے کے معنی میں مجھہ ہونے پر ایمان غیب پر ایمان کے مساوی ہے، کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بیک وقت غیب پر ایمان بھی رکھتا ہو اور اس سے عاری بھی ہو؟

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”محمد ﷺ کا مجھہ غیر بشری امور کی صنف سے نہیں ہے، اگرچہ ایک غیر بشری فعل ہے۔“ اس جملے کے معنی بھی میرے لئے بہم ہی ہیں اور اس کی

اس کے بعد ”قرآن کا اعجاز کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے“ کے عنوان سے اسی مقالے میں ایک دلچسپ بحث کی ہے اور اسی کے ضمن میں ایک نہایت اہم اور قیمتی کتاب ”سیر تحول قرآن“ کی طرف اشارہ کیا ہے، جو حال ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے اور اس کتاب کے بلند پایہ مولف کی گراں قدر کشف و تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے ثابت کیا ہے کہ آئیوں کے چھوٹے ٹڑے ہونے اور رسول اکرم پر وحی شدہ کلمات میں روز بروز اضافے نے ۲۳ سال کی مدت میں ایک دقیق منظم اور خارق عادت مختین قائم کی ہے۔

پھر خود اس طرح اضافہ کرتے ہیں:

”دنیا میں کون مقرر اور سخن و رایسا ہے، جس کی عبادت کی لمبائی سے ہر جملہ کی ادائیگی کا سال معین کیا جا سکتا ہے؟ باخصوص جب کہ یہ عبارت کسی ایسی کتاب کا متن نہ ہو، جو ایک ادیب یا علمی شخصیت کا شاہکار ہو، اور جو اس کی طرف سے ایک معین وقت میں رشته تحریر میں لایا گیا ہو بلکہ یہ وہ کلام ہے جو ایک انسان کی پر تلاطم زندگی کے ۲۳ برسوں میں اس کی زبان پر جاری ہوا، خاص کر جب ایسی کتاب بھی نہ ہو، جو کسی خاص موضوع یا معین شدہ عنوان کے تحت تالیف کی گئی ہو بلکہ جس میں طرح طرح کے ایسے مسائل ہوں، جو معاشرے کی ضرورتوں کے پیش نظر اور مختلف سوالات کے جوابات کے طور پر عنوان کئے گئے ہوں، ایسے حادث واقعات یا مسائل جو ایک طویل جدوجہد کے دوران پیش آتے ہیں اور ایک رہبر رہنماء کے ذریعے سے بیان ہوتے ہیں اور پھر انہیں منظم شکل میں جمع کر لیا جاتا ہے۔

(رسالہ فلق، کتاب اول، ص ۲۵)

کی نوعیت سے نہیں ہے، کہ برخلاف بشری کاموں کی نوع سے ہے کیوں کہ اس کا تعلق کلام و بیان و علم اور کلچر سے ہے، لیکن اس کے باوجود ایک غیر بشری عمل اور فعل ہے، یعنی بشری طاقت سے باہر ہے، اس کا سرچشمہ ایک غیبی اور ماورائے طبیعی طاقت ہے، اگر مقصود یہ ہو، اور یہی ہونا بھی چاہئے تو یہ خود غیب کا، ماورائے طبیعت کا، خارق العادات کا اور بالآخر ان تمام چیزوں کا اقرار و اعتراف ہے، جنہیں عجیب و غریب امور کہا جاتا ہے، پھر کیوں شروع سے ہم مجرمے اور خارق عادات امور کو خرافات و نامعمول امور کی مانند سمجھیں۔ کیا ہمیں شروع سے ہی مجرمے اور غیر معمولی فعل کے حساب کو خرافات و اوهام کے حساب سے جدا رکھنا نہیں چاہئے تھا تاکہ نادا قف اور کم علم افراد ان تجربات سے کچھ اور نہ سمجھیں، جو ہمارا مقصد بھی نہیں ہے اور بنیادی طور پر ”پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم“ کی کتاب مجذہ ہے، جیسی مشہور تعبیر کو بدلت ہم یہ کیوں کہیں کہ ”پیغمبر کا مجذہ کتاب ہے“ تاکہ نامناسب تعبیر و تفسیر کرنے کی گنجائش پیدا ہو۔

اسی محترم دانش ور کا ایک مقالہ تہران یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات کے رسالہ ”فلق“ میں قرآن اور کمپیوٹر کے زیر عنوان شائع ہوا تھا، جس کو مسئلہ اعجاز کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کی تصحیح اور ان کے غور و فکر کی تدریجی ترقی و ارتقاء کی علامت سمجھا جا سکتا ہے۔

اس مقالے میں قرآن مجید کے الفاظ کو کمپیوٹر کی علامتوں سے بدلنے اور قرآن کی حقیقتوں کے کشف و اطہار کے لئے انسانی ترقی و تمدن کے اس عظیم مظہر (کمپیوٹر) سے استفادہ کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے، جو درحقیقت بہت بہر محل پیشکش ہے، پھر اس مقالے میں ان بعض مصری دانش و روسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جنہوں نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے، اور اس کے ساتھ بعض ایرانی مسلمان انجینئروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جو اس سلسلے میں کام کرنے کا ارادہ کر سکتے ہیں یا کر چکے ہیں،

تھے اور تلاوت قرآن ان کی روح کے آرام و سکون کا سرمایہ تھی۔

قرآن کیلئے مسلمانوں کی عظیم کوشش

مسلمانوں نے ہر زمانے میں اپنی آسمانی کتاب سے شوق و عشق کی بناء پر اپنے علمی و فکری وسائل کے مطابق قرآن مجید کے سلسلے میں کام کئے ہیں، جسے اسے حفظ کرنا اور اپنے سینیوں کے سپرد کر دینا، قرات و تجوید کے استاذہ اور ماہرین کی قرات، معانی کی تفسیر، لغات کی تشریع و توضیح کے لئے مخصوص لغت کی کتابوں کی تصنیف و تالیف، تمام آیتوں کلکوں یہاں تک کہ پورے قرآن میں جتنے حروف ہیں، ان کو بھی شمار کر لینا، یہ سب کام بڑی محنت سے کئے گئے ہیں۔ قرآن کے معانی و مطالب پر باریک بینی کے ساتھ تحقیق اور قانونی، اخلاقی، اجتماعی، فلسفی، عرفانی اور سائنسی مسائل میں قرآن مجید سے استفادہ کرنا، اپنے اقوال اور تحریروں کو قرآنی آیات سے زینت دینا، قرآنی آیات کے نفیس کتبے تیار کرنا یا چونے کے اوپر آیتوں کا لکھنا، ٹالکوں یا دوسری چیزوں پر قرآنی سورتوں اور آیتوں کو خوش خط و خوش نما خطوط اور طرز تحریر سے لکھنا، سہرے حروف میں قرآن نویسی، اپنے بڑے اور بڑی کوں کو ہر علم سکھانے سے پہلے قرآن کی تعلیم دینا، قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے علم صرف و نحو کے قواعد کی ترتیب و تدوین اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے علم معانی و بیان و بدیع کی اختراع و ایجاد، عربی زبان کی تمام لغات کو جمع کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ قرآن سے مسلمانوں کے عشق و محبت ہی کا نتیجہ تھا، جو عقلی و ادبی علوم کا ایک سلسلہ وجود میں آیا اور نہ اگر قرآن نہ ہوتا، تو یہ علوم بھی وجود میں نہ آتے۔

قرآن

قرآن کریم ہماری آسمانی کتاب اور ہمارے پیغمبر کا جاویدانی مجذہ ہے۔ یہ کتاب ۲۳۳ سال کی مدت میں تدریجیاً ہمارے پیغمبر پر نازل ہوئی، قرآن کریم جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب بھی ہے اور آپ کے اعجاز کا مظہر بھی، یہ کتاب عصائے موئی اور دم عیسیٰ کے اثر سے صد ہا گناہز رگ عظیم اثرات کی حامل ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے آیات قرآنی کی تلاوت فرماتے تھے اور ان آیات کی کشش و جاذبیت لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیتی تھی، تاریخ اسلام میں اس موضوع سے متعلق واقعات کی تعداد شمار کی حد سے باہر ہے۔ قرآن مجید ۱۱۳ سورتوں کا مجموعہ ہے اور یہ تمام سورتیں تقریباً ۵۰ آیتوں پر مشتمل ہیں اور ان تمام آیتوں میں ۸۷ ہزار لکھ ہیں۔

مسلمانوں نے صدر اسلام سے لے کر عصر حاضر تک قرآن پر بے انتہا توجہ دی ہے اور اس کے اہتمام کے سلسلے میں بے مثال دلچسپی کا ثبوت دیا ہے، جو قرآن کے ساتھ ان کی عقیدت کی دلیل ہے۔

قرآن کریم رسول اکرم کے مبارک زمانے ہی میں ایک جماعت کے ذریعے جسے خود حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی میں فرمایا تھا اور جو کتاب وہی کے نام سے مشہور ہوئی، لکھا جاتا رہا اس کے علاوہ اکثر مسلمان مرد اور عورتیں، چھوٹے اور بڑے پورا قرآن یا اس کی اکثر آیتوں کے زبانی یاد کرنے سے ایک عجیب عشق رکھتے تھے، قرآن کو نمازوں میں بھی پڑھتے تھے اور نمازوں کے علاوہ بھی دوسرے اوقات و حالات میں اس کی تلاوت کو ثواب سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت سے (روحانی) لذت حاصل کرتے

قرآن کے معجزانہ پہلوں

قرآن کریم مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے معجزہ، یعنی طاقت بشری سے بالاتر ہے، یہاں پر ہم اس کے بارے میں مختصر طور پر گفتگو کریں گے۔ قرآن کریم کا معجزہ ہونا کلی اعتبار سے دو جهات سے ہے۔ ایک لفظی دوسری معنوی، قرآن کا لفظی اعجازِ حسن و زیبائی کی صنف سے ہے اور اس کا معنوی اعجازِ علیٰ دنیا سے متعلق ہے، پس قرآن کا اعجاز ایک تو زیبائی اور ہنر کے پہلو سے ہے اور دوسرے فکری و علمی پہلو سے۔ ان دونوں پہلوؤں میں سے ہر ایک خصوصاً علمی پہلو کوئی گوشوں کا حامل ہے۔

الفاظ قرآن

قرآن مجید کا اسلوب نہ شعری ہے اور نہ نثری۔ شعری اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں وزن اور قافیہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شعر عام طور سے ایک شاعرانہ تخلیل کے تحت وجود میں آتا ہے۔ شعر کی بنیاد یا صحبت و درستی مبالغہ و افراط پر ہوتی ہے، جو ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ قرآن میں نہ تو شعری تخلیلات کا وجود ہے اور نہ خیالی تشبیہات کا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن نہ بھی نہیں ہے کیوں کہ اسے جو ظلم، آہنگ اور ایک (خصوص انداز) موسیقی حاصل ہے وہ کسی نثری کلام میں آج تک دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ مسلمانوں نے ہمیشہ قرآن کریم کی تلاوت اس کے خصوص انداز میں خوش لحنی کے ساتھ کی ہے اور کرتے ہیں، دینی احکام میں یہ موجود ہے کہ قرآن کریم کو اچھے انداز سے پڑھا کرو۔ آئندہ اطہار علیہم السلام کبھی کبھی اپنے گھروں میں ایسی دربار و لکش آواز میں تلاوت کرتے تھے کہ اس لگلی میں راستہ چلنے والے ٹھہر جاتے تھے۔ کوئی بھی نثری کلام قرآن کی طرح آہنگ نہیں رکھتا، وہ بھی ایسا انداز و آہنگ جو

اعجاز قرآن

قرآن مجید حضرت رسول خدا علیہ السلام کا ہمیشہ رہنے والا ماجزہ ہے، مکہ میں نازل ہونے کی ابتداء ہی سے جب کہ چھوٹی چھوٹی سورتوں سے آغاز نزول ہوا، تو رسول اکرم نے باقاعدہ طور پر اس کا مثل و ماندلا نے کے لئے کفار کے کچلخ کیا، یعنی آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میرا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے یا کسی اور بشر کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کی نظر پیش کر سکے اور اگر تمہیں یقین نہ ہو تو اس کی آزمائش کر لو، لیکن یہ جان لو، اگر تمام جن و انس بھی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیں، تاکہ اس قرآن کا مثل لے آئیں، تو بھی وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔

پیغمبر کے مخالفین نہ تو اس زمانے میں اور نہ اس کے بعد سے آج تک جس کو چودہ صد یاں گذر گئیں (بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ گذر گیا) اس چلخ کا جواب دے سکے ہیں۔ اس زمانے کے مخالفین کا آخری جواب یہ تھا کہ یہ تو جادو ہے۔ مخالفین کا یہ الزام خود قرآن مجید کے غیر معمولی ہونے کا اعتراف اور قرآن کے مقابلے میں ان کا ایک طرح کا اظہار عاجزی ہے۔ پیغمبر اکرم علیہ السلام کے دشمنوں نے جہاں تک ممکن تھا، ان کو کمزور و مغلوب کرنے کے لئے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ البتہ صرف ایک کام تھا، جس پر انہوں نے کوئی اقدام نہیں کیا، کیوں کہ وہ اس کام میں سوفیض نہ امید تھے، یعنی یہ کام وہی تھا، جس کا بار بار پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اعلانیہ طور پر چلخ کیا تھا، مگر ان کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

خود قرآن مجید نے بھی اس امر کی تصریح کی ہے، یعنی قرآن کی ماندگم از کم ایک سورہ لانے کا چلخ (اگرچہ ایک سطر کی صورت ہی ہو، جیسے سورہ انا عطیناك الكوثر)۔

نے یہ نہیں سوچا کہ اپنے ماہر اور تجربہ کار مقرر ووں اور ادیبوں سے مدد حاصل کر کے قرآن کے چیلنج کا جواب دیں اور قرآن کی مانند کم از کم چھوٹا سا ہی سورہ بنالائیں اور دنیا والوں کے سامنے پیش کر دیں۔ اسی طرح تاریخ اسلام میں بھی بہت سے ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں، جو اصطلاح میں ”زنادقة“ یا ”ملادۃ“ کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور ان میں سے چند افراد تو غیر معمولی شہرت کے مالک تھے، اس گروہ نے بھی مختلف طریقوں سے دین کے خلاف عام طور پر اور قرآن کے خلاف خاص طور پر بہت سی باتیں کہیں ہیں، ان میں سے کئی افراد تو عربی زبان میں فن خطابت کے بادشاہ شمار کئے جاتے ہیں، کبھی کبھی یہ لوگ بھی قرآن کے ساتھ نزاع اور خناصمت پر اتر آتے ہیں، لیکن ان سب طریقوں کا جو تہذیب تجویز نکلا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے قرآن کی عظمت کو روشن تر اور اس کے مقابلے میں اپنے کو حقیر تر ظاہر کر دیا ہے۔

تاریخ نے اس موقع پر ابن راوندی، ابوالعلام عمری اور عرب کے نامور شاعر ابوطیب متنبی کے متعلق بہت سی کہانیاں اس بارے میں ثابت کی ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے قرآن کو ایک بشری فعل ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ بہت سے افراد نبوت کا دعویٰ کر کے اٹھے اور انہوں نے کچھ کلام پیش کئے جو ان کے خیال میں قرآن کے مشابہ تھے اور ان لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے یہ کلام بھی قرآن کی مانند ہیں اور خدا کی طرف سے ہیں ”طلیح“ اور ”مسیلمہ“ اور ”سباح“ کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ اس گروہ نے بھی بالآخر ایک دوسری طرح سے اپنی عاجزی اور قرآن مجید کی عظمت کو واضح دروشن کیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ خود پیغمبر کا کلام جن کی زبان مقدس پر کلام الٰہی جاری ہوا، قرآن سے مختلف ہے۔ پیغمبر خدا ﷺ کے بہت سے کلمات، خطبوں، دعاوں، مختصر جملوں اور حدیثوں کی شکل میں موجود ہیں اور فصاحت کی انتہائی بلندی پر ہیں، مگر

روحانی عوامل سے منابعت رکھتا ہونہ کہ ایسا آہنگ جو ہو لعب کی محافل سے منابعت رکھتا ہو۔ ریڈیو کی ایجاد کے بعد کوئی بھی روحانی کلام روحانی آوازوں کے متحمل ہونے اور دلکشی دلربائی کے لحاظ سے قرآن کی برابری نہیں کر سکا۔ اسلامی ملکوں کے علاوہ دوسرے غیر اسلامی ملکوں نے بھی اس کے دلکش آہنگ کی وجہ سے ہی اپنے ریڈیو کے پروگراموں میں اسے جگہ دی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا حسن صورت اور اس کی زیبائی دلکشی نے زمان و مکان کے پردوں کو لپیٹ کر پیچھے پھینک دیا ہے۔ بہت سی باتیں اور بہت سے کلاموں کی دلکشی کسی خاص وقت اور زمانے سے مر بوط ہوتی ہے، جو دوسرے زمانے کے ذوق سے قطعاً میں نہیں کھاتی یا وہ کلام کم از کم کسی ایک قوم و ملت کے مذاق کے مطابق ہوتا ہے، جو مثلاً کسی مخصوص زبان سے بہرہ مند ہوتے ہیں، لیکن قرآن کی زیبائی اور دلکشی نہ تو کسی زمانے سے مخصوص ہے اور نہ کسی جگہ، قوم و نسل اور زبان والوں سے۔ وہ تمام لوگ جو قرآن کے مفہایم اور زبان سے آشنا ہو گئے ہیں، انہوں نے اس کو اپنے ذوق کے مطابق پایا ہے، جتنا بھی زمانہ گزرتا جاتا ہے اور جس قدر مختلف قویں قرآن سے آشنا کی حاصل کرتی ہیں، اتنی ہی قرآن کی خوبیوں سے متاثرا اور اس کی زیبائی و دلکشی پر فریغتہ ہوتی جاتی ہیں۔

متعصب یہودیوں اور عیسائیوں اور چند دوسرے مذاہب کے مانے والوں نے ان اسلامی چودہ صدیوں کی طویل مدت کے دوران قرآن کی عظمت و منزلت کو گھٹانے اور کمزور کرنے کے لئے طرح طرح سے مقابلے کئے ہیں اور قسم قسم کے ہتھیں دے آزمائے ہیں۔ کبھی قرآن میں تحریف ہونے کا پروپیگنڈہ کیا، کبھی قرآن میں بیان شدہ بہت سے قصوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی اور کبھی دوسرے مختلف طریقوں سے قرآن کے خلاف سرگرم عمل رہے، لیکن کبھی انہوں

تقریروں اور اپنے کلام میں خوبصورتی اور جاذبیت پیدا کرتے ہیں۔ قرآن نے نہ تو ان موضوعات کو پیش کیا ہے اور نہ ان موضوعات کے بارے میں دادخنی دی ہے۔ قرآن نے جن موضوعات کو پیش کیا ہے وہ سب کے سب معنوی ہیں اور تو حید، معاد، نبوت، اخلاق، احکام، مواعظ و نصائح اور قصوص سے عبارت ہیں اور ان سب حالات میں دلکشی و زیبائی کی اعلیٰ منزل پر پہنچا ہوا ہے۔

قرآن کریم میں کلمات کی ترتیب و تنظیم بے نظر و بے عدیل ہے، آج تک کوئی شخص بھی قرآن مجید کی حسن و زیبائی پر دھبہ ڈالے بغیر قرآن کے ایک کلمے کو بھی ادھر سے ادھر نہیں کر سکا ہے اور نہ آج تک کوئی شخص قرآن کی نظری لا سکا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن ایک حسین و خوش نما عمارت کی مانند ہے کہ نہ تو کوئی شخص اس میں تبدیلی اور اس کے اجزاء کو ادھر سے ادھر کر کے اس کی زیبائی و خوشنامائی میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے اور نہ اس سے بہتر یا اس کی مانند بنا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی بناؤٹ اور اس کا اسلوب یا باکل نزال ہے نہ تو اس سے پہلے کوئی اس کی مثال ملتی ہے اور نہ (قرآن کے تمام تر چیز کے باوجود) اس کے بعد ملتی ہے اور نہ ملے گی، یعنی نہ تو اس سے پہلے کسی نے اس اسلوب میں کوئی بات کہی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کا مثل لا سکا یا اس اسلوب کی تقلید کر سکا۔

قرآن کا چیلنج آج بھی اسی طرح پہاڑ کی مانند قائم اور اُنہیں ہے اور ہمیشہ اُنہیں رہے گا۔ آج بھی تمام اہل ایمان دنیا کے تمام لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ اس مقابلے میں شرکت کریں اور اگر آج بھی قرآن کا مثل و مانند پیدا ہو جائے، تو مسلمان اپنے دعوے اور ایمان سے ستبردار ہو جائیں گے لیکن انہیں اس بات پر مکمل یقین ہے کہ اس قسم کی چیز کبھی ممکن نہیں ہے۔

کسی طرح سے بھی قرآن کا رنگ و بواس کے اندر موجود نہیں ہے۔ یہ خود اس امر کی واضح دلیل ہے کہ قرآن اور پیغمبر کے کلام کے سرچشمے الگ الگ ہیں۔ قرآن کا منبع اور ہے اور احادیث کا منبع دوسرا ہے۔ حضرت علیؓ تقریباً ۱۰۰ سال کی عمر سے قرآن سے آشنا ہیں، یعنی علیؓ کا سن مبارک مذکورہ حدود میں تھا کہ قرآن کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اور علیؓ اس پیاسے کی طرح جو صاف و شفاف پانی تک پہنچ جائے، ان آیتوں کو حفظ فرمایا کرتے تھے اور پیغمبر اکرم ﷺ کی آخری عمر مبارک تک علیؓ کا نام کا تباہ و حی میں سرفہرست تھا۔ علیؓ حافظ قرآن تھے اور ہمیشہ قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ راتوں کو جب عبادت کے لئے کھڑے ہوتے تھے، تو آیات قرآنی کی تلاوت سے خوش رہتے تھے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود اگر قرآن کی بناؤٹ اور اس کا اندازہ تقلید کے قابل ہوتا، تو کواس بے نظیر صلاحیت کی بناء پر جو آپ کو فضاحت و بلاغت کے میدان میں حاصل تھی اور قرآن کے بعد آپ کے کلام کی کوئی نظری اور مثال نہیں مل سکتی، قرآن کے انداز بیان کے زیر اثر ہونے کی بناء پر قرآن ہی کے طرز و انداز کی پیروی کرنا چاہئے تھی اور آپ کے تمام خطبے اور تمام تحریریں خود بخود آیات قرآنی کی شکل میں ڈھل جاتیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کا انداز علیؓ کے کلام کے انداز سے مکمل طور پر مختلف اور جدا ہے۔ حضرت علیؓ اپنے روشن اور فضیح و بلیغ خطبوں کے ضمن میں جب کبھی کوئی قرآنی آیت پیش کرتے تو وہ آپ کے کلام سے بالکل عیینہ محسوس ہوتی، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی بڑا ستارہ چھوٹے ستاروں کے درمیان اپنی غیر معمولی چک دمک اور امتیازی شان کا حامل ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے ایسے موضوعات کو پیش نہیں کیا ہے، جو عام طور سے تقریر و خطابت میں انسان کی ہمنامائی کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اگر لوگ اپنی خطابت کے جو ہر دکھانا چاہتے ہیں تو فخر مدد، ہجوم (کسی کی نہ مدت کرنا)، مرتبہ، غزال اور قدرتی حسن و جمال کی تعریف و توصیف کے ذریعے اپنی

انسان جب تک اپنے کو نہیں پہچانے گا، اپنے اللہ کو بھی صحیح طریقے سے نہیں پہچان سکتا، دوسری طرف انسان صرف خداشناست کے ذریعے ہی اپنی حقیقت کو پہچان سکتا ہے۔ پیغمبروں کے ملتب فکر میں کہ قرآن جس کا مکمل ترین نمونہ ہے، انسان، اس انسان کے مقابلے میں جس کو بشرط علم و منطق کے ذریعے پہچانتا ہے، بہت مختلف ہے یعنی وہ پہلا انسان بہت وسیع معنی رکھتا ہے، جب کہ علوم کے ذریعے سے پہچانا جانے والا انسان پیدائش اور موت کے درمیان قائم ہے، ان حدود سے قبل اور بعد بالکل تاریکی چھائی ہوئی ہے اور بشری علوم کے لئے یہ چیزیں بالکل نامعلوم ہیں۔

لیکن قرآن ان کا انسان ان دو حدود کے درمیان محدود نہیں ہے بلکہ وہ دوسری دنیا سے آیا ہے اور اسے اپنے آپ کو دنیا کے درسے میں مکمل کرنا ہو گا اور اس کا مستقبل اس دنیا میں الہی امر سے وابستہ ہے کہ اس دنیا کے درسے میں اس نے کس قسم کی کار کر دگی، تلاش و کشش یا کامی و سستی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے علاوہ پیدائش اور منطق، نہ تاریخ ہے نہ ادب ہے اور نہ کسی فن و ہنر کا شاہکار، لیکن سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب خصوصیات کے علاوہ مزید خصوصیات کا حامل بھی ہے۔ قرآن انسانوں کی رہنمائی کی کتاب ہے اور حقیقت میں وہ ”انسان“ کی کتاب ہے، لیکن انسان بھی کون سا؟ ایسا انسان جس کو انسان کے خدا نے پیدا کیا ہے اور انہیاں کی آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو اس کی حقیقت سے آگاہ کریں اور اس کی سعادت و نیک بخشی کا راستہ اس کے لئے کھول دیں اور قرآن چونکہ انسان کی کتاب ہے، پس اللہ کی کتاب بھی ہے، کیوں کہ انسان ہی وہ موجود ہے، جس کی خلقت اس دنیا سے قبل ہوئی ہے اور جس کا وجود اس دنیا کے بعد باقی رہے گا، یعنی انسان بنظر قرآن روح الہی کا ایک نسخہ ہے اور بہر حال اسے اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کی معرفت اور انسان کی خودشناستی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔

معانی قرآن

معانی و مطالب کے لحاظ سے قرآن کا اعجاز تفصیلی بحث کا مقاضی ہے اور کم از کم ایک الگ کتاب کا محتاج ہے۔ البتہ مختصر قرآن کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جاسکتی ہے، تمہید کے طور پر یہ جان لیما چاہئے کہ قرآن کس نوعیت کی کتاب ہے؟ کیا فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ کتاب سائنسی، ادبی یا تاریخ کی کتاب ہے؟ یا یہ کہ صرف فن و ہنر کا ایک شاہکار ہے؟ جواب یہ ہے کہ قرآن ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ بلکہ تمام انبیاء بالکل ایک جدا گانہ حیثیت کے حامل ہیں، لیکن اس کے نہ منطقی اور نہ ادبی اور مورخ ہیں اور نہ ہی ہنرمند اور صنعت گر ہیں، لیکن اس کے باوجود کہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہیں، پھر بھی ان تمام خصوصیات کے علاوہ بعض زائد خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسی طرح قرآن بھی جو آسمانی کتاب ہے، نہ فلسفہ ہے نہ منطق، نہ تاریخ ہے نہ ادب ہے اور نہ کسی فن و ہنر کا شاہکار، لیکن سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب خصوصیات کے علاوہ مزید خصوصیات کا حامل بھی ہے۔ قرآن انسانوں کی رہنمائی کی کتاب ہے اور حقیقت میں وہ ”انسان“ کی کتاب ہے، لیکن انسان بھی کون سا؟ ایسا انسان جس کو انسان کے خدا نے پیدا کیا ہے اور انہیاں کی آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو اس کی حقیقت سے آگاہ کریں اور اس کی سعادت و نیک بخشی کا راستہ اس کے لئے کھول دیں اور قرآن چونکہ انسان کی کتاب ہے، پس اللہ کی کتاب بھی ہے، کیوں کہ انسان ہی وہ موجود ہے، جس کی خلقت اس دنیا سے قبل ہوئی ہے اور جس کا وجود اس دنیا کے بعد باقی رہے گا، یعنی انسان بنظر قرآن روح الہی کا ایک نسخہ ہے اور بہر حال اسے اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کی معرفت اور انسان کی خودشناستی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔

کے واسطے جو مسائل پیش کئے گئے ہیں، وہ دوسرے چند مسائل کے علاوہ ہیں۔

قرآنی موضوعات

قرآن کریم میں جو موضوعات پیش کئے گئے ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں اور انہیں الگ الگ شمار نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی مندرجہ ذیل مسائل پر اجمالاً نظر ڈالی جا رہی ہے:

۱۔ اللہ اور اس کی ذات، صفات اور یکتائی اور وہ چیزیں جن سے ہمیں اللہ کو منزہ سمجھنا چاہئے اور وہ چیزیں جن سے ہمیں خدا کو متصف سمجھنا چاہئے۔ (صفات سلبیہ اور صفات ثوبتیہ)

۲۔ قیامت، محشر، تمام اموات کو زندہ کر کے اٹھانا اور موت سے لے کر قیامت تک کے مرال۔ (بر ZX)

۳۔ ملائکہ: فیضِ رسانی کے ذرائع، وہ غیر مریٰ قوتیں جو خود آگاہ بھی ہیں اور خدا آگاہ بھی اور خدا کے احکام جاری کرنے والے ہیں۔

۴۔ انبیاء و مرسلین یا وہ انسان جو وحی الہی کو اپنے ضمیر میں دریافت کرتے ہیں اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔

۵۔ اللہ پر ایمان لانے اور قیامت ملائکہ پیغمبروں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کے لئے رغبت اور شوق دلانا۔

۶۔ آسمانی، زمینیوں، پہاڑوں، سمندروں، درختوں، حیوانات، بادل، ہوا، بارش، برف اور اولے اور ٹوٹنے والے ستاروں وغیرہ کی خلقت (اور ان پر غور و فکر)۔

۷۔ خدائے واحد و یکتا کی عبادت اور اس میں خلوص نیت پیدا کرنے، کسی شخص یا کسی چیز کو عبادت میں خدا کا شریک قرار نہ دینے کی طرف دعوت اور غیر خدا

چیزوں کے بارے میں جنہیں قرآن خدا کی طرف واپسی کہتا ہے، یعنی قیامت، حشر و شر، قیامت کے خطرات ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں اور سخت عذاب اور اس کا کچھ لوگوں کے لئے ابدی ہونا مختصر یہ کہ بعد از موت جو جو مراحل پیش آنے والے ہیں، ان پر تامل و فکر کرے اور ان سے آگاہی حاصل کرے اور سب پر عقیدہ رکھے اور ان پر ایمان لائے اور خدا کو جس طرح اول اور موجودات کا نکتہ آغاز بھی جانتا ہے، اسی طرح آخر اور تمام موجودات کی بازگشت واپسی کا نکتہ آغاز بھی جانے کے لئے کہ وہ کہاں ہے؟ دنیا کے نظاموں اور طور طریقوں کو پہچانے اور تمام موجودات کے درمیان انسان کے مقام و منزلت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور موجودات کے درمیان اپنی حقیقت کو پھر سے پالے اور یہ جانے کے لئے کہ اسے کیسا ہونا چاہئے؟ انسانی خصلتوں اور عادتوں کو پہچانے اور اپنے آپ کو انہیں اخلاق و خصال کی بنیاد پر استوار کرے اور انہی کے مطابق خود کو ڈھانے کی کوشش کرے یہ جانے کے لئے کہ اسے کیا کرنا چاہئے انفرادی و اجتماعی مقررہ امور و احکام کی پیروی کرے۔ ان مذکورہ تمام بالوں کے علاوہ قرآن کے انسان کو چاہئے کہ غیر محسوس اور دکھائی نہ دینے والے موجودات اور خود قرآن کے الفاظ میں ”غیب“ پر ان کے ارادہ الہی کے مظہر اور واسطہ ہونے کی حیثیت سے ایمان لائے اور نیز یہ جاننا چاہئے کہ خداوند متعال نے کسی زمانے اور کسی وقت میں بھی بشر کو جو آسمانی ہدایت کا ہمیشہ محتاج رہا ہے، مہمل اور بغیر ہادی کے نہیں چھوڑا ہے اور ہمیشہ اللہ کے برگزیدہ اقرار، جو اللہ کے پیغمبر اور خلق خدا کے رہنماء ہے ہیں، خداوند عالم کی طرف سے مبعوث ہوتے اور الہی پیغام کو بندوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔

قرآن کا انسان کائنات پر ایک آیت و نشانی کی حیثیت سے اور دنیا کی تاریخ پر ایک تجربہ گاہ کے عنوان سے جو پیغمبروں کی تعلیمات کے صحیح ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے، نگاہ ڈالتا ہے! ہاں قرآن کا انسان ایسا ہی ہے اور قرآن میں انسان

تعاون کرنا، بغض و حسد کو دل سے نکال پھینکنا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برائیوں سے منع کرنا، راہ خدا میں جان و مال کے ذریعے جہاد کرنا وغیرہ۔

۱۶۔ احکام جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، حج، جہاد، نذر، قسم، تجارت، رہن، اجارہ، ہبہ، بیوی و شوہر کے حقوق، والدین اور اولاد کے حقوق، طلاق، لعan، ظہار، وصیت، میراث، قصاص، حدود و تعزیرات، قرض، قضا، گواہی، حلف (قسم)، ثروت، مالکیت حکومت، شوریٰ، فقراء کا حق، معاشرے کا حق وغیرہ وغیرہ۔

۱۷۔ رسول اکرم کے ۲۳ سالہ دور بعثت کے حادثات و واقعات۔

۱۸۔ رسول اکرم کے احوال و خصوصیات، آپ کی صفات حمیدہ اور جن مصائب سے آپ دوچار ہوئے۔

۱۹۔ ہر زمانے کے تین گروہوں، مومنوں، کافروں اور منافقوں کی عام صفات کا بیان۔

۲۰۔ دور بعثت کے مومنین، کافرین اور منافقین کے اوصاف کا ذکر۔

۲۱۔ فرشتوں کے علاوہ دوسرا دکھائی نہ دینے والی مخلوقات، جنات اور شیطان وغیرہ۔

۲۲۔ تمام موجودات عالم کا حمد و تسبیح کرنا اور تمام موجودات کے اندر اپنے خلق و پروردگار کے بارے میں ایک قسم کی آگاہی کا ہونا۔

۲۳۔ خود قرآن کی توصیف (تقریباً پچاس اوصاف کا ذکر)۔

۲۴۔ دنیا اور دنیا کی سنتیں، دنیوی زندگی کی ناپائیداری اور اس کا اس قابل نہ ہونا کہ انسان کا آئینڈیل اور اس کی کامل آرزو قرار پائے اور یہ کہ خدا اور آخرت یعنی ہمیشہ باقی رہنے والی دنیا ہی اس قابل ہے کہ انسان کا انتہائی مقصود و مطلوب قرار پائے۔

چاہے وہ کوئی انسان ہو یا فرشتہ، سورج ہو یا ستارہ، درخت ہو یا بت، کی عبادت و پرستش کی سخت ممانعت۔

۸۔ اس دنیا میں خداوند عالم کی نعمتوں کو یاد دلانا۔

۹۔ نیک کاروں اور اعمال صالحہ جوالانے والوں کے لئے اس دنیا کی ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتیں اور بد کاروں اور سرکشوں کے لئے اس دنیا کا سخت عذاب اور کچھ لوگوں کے لئے ابدی عذاب۔

۱۰۔ اللہ کے وجود اور وحدانیت اور قیامت اور پیغمبروں کے بارے میں دلیلوں اور حجتوں کا بیان اور ان بیانات کے ضمن میں کچھ غنیبی خبروں کا ذکر۔

۱۱۔ ایک انسانی تجربہ گاہ اور لیپارٹری کے عنوان سے تاریخ اور قصے جو پیغمبروں کی دعوت کی حقانیت کو روشن کرتے ہیں اور انہیاء کی سیرت پر عمل کرنے والوں کا انعام بخیر ہونا اور انہیاء کی تکنیک کرنے والوں کا برائیجام۔

۱۲۔ تقویٰ و پرہیز گاری اور تزکیہ نفس۔

۱۳۔ نفس امارہ اور نفسانی خواہشات اور شیطانی و سوسوں کے خطرات کی طرف متوجہ رہنا۔

۱۴۔ اچھے انفرادی اخلاقیات، جیسے شجاعت، استقلال و پائیداری، صبر، عدالت، احسان، محبت، ذکر خدا سے محبت، شکر خدا، خدا سے ڈرتے رہنا، خدا پر بھروسہ، خدا کی خوشی پر راضی رہنا اور فرمان خدا کے سامنے سر جھکا دینا، عقل سے کام لیانا، سوچنا اور غور و فکر کرنا، علم و معرفت کا حصول اور تقویٰ، سچائی اور امانت کے ذریعے دل میں نورانیت پیدا کرنا۔

۱۵۔ اجتماعی اخلاق جیسے اتحاد و تکہی اور ہم آہنگی، آپس میں ایک دوسرے کو حق و مہربکی وصیت کرتے رہنا، نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ

کہ قرآن کریم نے ان اکثر مسائل میں نئے نئے افق پیدا کر دیے ہیں۔

اللہ اور قرآن

یہاں ہم مذکورہ بالاموضوعات میں سے صرف ایک موضوع کی طرف اشارہ کریں گے اور وہ موضوع خدا اور جہان اور انسان سے اس کا رابطہ اور تعلق ہے، ہم اگر اسی ایک موضوع کے بیان کرنے پر اکتفا کریں اور اس کا موازنہ انسانی افکار و نظریات سے کریں، تو قرآن کا غیر معمولی نوعیت کا ہونا اور مجھہ ہونا ثابت ہو جائے گا۔

قرآن نے خدا کی صفات بیان کی ہیں اور اس تو صیف میں ایک طرف تو اسے پاک اور منزہ قرار دیا ہے اور اس کی ایسی صفات کی نفی کی ہے، جو اس کے شایان شان نہیں ہیں اور اس کو ان صفات سے پاک و منزہ جانا ہے اور دوسری طرف صفات کمال اور اسماء حسنی کو ذات خدا کے لئے ثابت کیا ہے۔ تقریباً ۱۵ آیتیں خداوند عالم کی تنزیہ میں نازل ہوئی ہیں اور تقریباً پچاس (۵۰) آیتوں سے زیادہ ایسی ہیں، جو صفات کمال اور اسماء حسنی سے خداوند عالم کے متصف ہونے کے بارے میں ہیں، قرآن مجید اپنی ان توصیفات میں ایسا باریک ہیں نظر آتا ہے، جس نے زیادہ سے زیادہ عین قلمرو نظر رکھنے والے علماء الہی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور یہ خود ایک اُتی اور ان پڑھ شخص کا روشن ترین مجھہ ہے۔ قرآن نے معرفت اور خداشناسی کی راہیں دکھانے کے لئے تمام موجود را ہوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ آفاقی اور نفسی نشانیوں کے مطالعہ کا راستہ، نفس کے تزکیہ اور اس کی صفائی کا راستہ، بطور کلی وجود ہستی کے بارے میں گہرائی کے ساتھ غور و فکر کا راستہ قبل ترین مسلمان فلاسفہ نے اپنی حکام اور مضبوط ترین دلیلوں کو اپنے اقرار اور اعتراف کے مطابق قرآن مجید ہی سے اخذ کیا ہے۔

- ۲۵۔ انبیاء کے کرام کے مஜرا تا اور غیر معمولی افعال۔
- ۲۶۔ گذشتہ آسمانی کتابوں کی تائید و تصدیق خصوصاً تورات و انجیل کی اور ان دونوں کتابوں میں کی جانے والی تحریفوں اور غلطیوں کی تحقیق۔

معانی قرآن کی وسعت

اوپر جو باتیں بیان کی گئی ہیں، وہ قرآن مجید میں بیان شدہ موضوعات کی ایک اجمالي فہرست ہے، پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اختصار کے لحاظ سے بھی یہ کافی ہے، اگر انسان، خدا اور دنیا کے بارے میں انہی مختلف موضوعات کو نظر میں رکھیں اور ان کا انسان کے بارے میں لکھی گئی کسی بھی کتاب سے موازنہ کریں، تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی کتاب بھی قرآن سے موازنے کی منزل پر نہیں آ سکتی، بالخصوص اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک ایسے شخص کے ذریعے سے نازل ہوا ہے، جو اُتی اور ان پڑھ تھے اور کسی عالم و دانش کے افکار سے واقف و آشنا نہیں تھے اور مزید برآں بطور خاص اگر ہم اس امر پر غور کریں کہ ایسے شخص کا ظہور ایسے ماحول میں ہوا تھا، جو ہمارے بشری ماحول سے زیادہ جاہل ماحول تھا اور اس ماحول کے لوگ عموماً علم و تمن سے بیگانہ محسن تھے، قرآن نے ان سے بہت وسیع معانی و مطالب بیان کئے ہیں اور انہیں اس طرح پیش کیا ہے کہ بعد میں خود قرآن ہر قسم کے استفادے کا شیع و سرچشمہ بن گیا، فلاسفہ کے لئے بھی اور علماء فقہ و اخلاق و تاریخ وغیرہ کے لئے بھی۔ یہ امر ناممکن بلکہ محال ہے کہ کوئی فرد بشرخواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی و دانش و رہوا پنی طرف سے ان سب معانی و مطالب کو ایسی معیاری سطح پر بیان کر سکے، جو دنیا کے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں کے افکار کو اپنی طرف کھینچ لے۔ یہ تو اس صورت میں ہے، جب ہم قرآنی مطالب کو علماء کے بیان کردہ مطالب کی سطح کے برابر فرض کریں، لیکن ہم اور لطیف بات یہ ہے

نسان کا خدا سے رشتہ و تعلق

قرآن کریم نے خدا کے ساتھ انسان کے رشتہ اور تعلق کو دلکش ترین انداز میں بیان کیا ہے، قرآن کا خدا، فلسفیوں کے خدا کے برخلاف ایک خشک و بے روح ور بشر سے مکسر بیگانہ وجود نہیں ہے۔ قرآن کا خدا انسان کی شرگ سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہے، انسان کے ساتھ لین دین رکھتا ہے اور اس کے مقابل میں انسان کو پنی رضا و خوشنودی عطا کرتا ہے، اس کو اپنی طرف جذب کرتا ہے اور اس کے دل کے آرام و سکون اور اطمینان کا سرمایہ ہے:

لَا يُنَبِّئُ اللَّهُ تَنْظِيمُ الْقُلُوبِ (٢٨) (سورة رعد، آية ٢٨)

انسان خدا سے انسیت اور الفت رکھتا ہے، بلکہ تمام موجودات اس کو چاہتے ہیں اور اسی کو پکارتے ہیں۔ تمام موجودات عالم اپنے اپنے وجود کی گہرائی سے اس کے ساتھ رازدار انہ رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں، اس کی حمد بجالاتے ہیں اور اس کی تسبیح کرتے ہیں:

ثُمَّ شَيْءٌ إِلَّا يُسَبِّحُ بِمُحَمَّدٍ وَلِكُنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيْحَهُمْ ۚ (

سورہ اسراء، آیت (۸۳)

فلسفیوں کا خدا جس کو وہ لوگ صرف محک اول اور واجب الوجود کے نام سے پہچانتے ہیں اور بس ایک ایسا موجود ہے، جو بشر سے بالکل بیگانہ ہے، جس نے نسان کو صرف پیدا کر دیا ہے اور اسے دنیا میں بھیج دیا ہے، لیکن قرآن کا خدا ایک ”مطلوب“ ہے، انسان کی لبستگی کا سرمایہ ہے، وہ انسان کو پر جوش بناتا اور ایثار و فربانی پر آمادہ کرتا ہے، کبھی کبھی تو اس کی رات کی نیند اور دن کے سکون کو بھی چھین

قرآن نے دنیا اور مخلوقات کے ساتھ خدا کے رابطے کو توحیدِ محس پر قرار دیا ہے، یعنی خداوند متعال اپنی فعالیت اور اپنے ارادہ و مشیت کو نافذ کرنے میں اپنا کوئی مدد مقابل اور رقیب نہیں رکھتا، اس کے تمام افعال اور ارادے اور سارے اختیارات اسی کے حکم اور اسی کی قضا و قدر کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا آنَتْ وَلَا قَوْمُكَ (سورہ هود آیت ۲۹)

”انہیں تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی جانتی تھی۔“

اور عرب کے تمام لوگوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اس کامدی نہیں ہوا کہ ہم ان قصوں کو جانتے ہیں۔

قرآن نے ان قصوں کو بیان کرنے میں توریت و انجیل کی پیروی نہیں کی ہے، البتہ ان کی اصلاح ضرور کر دی ہے، قوم سما، قوم شہود وغیرہ کے بارے میں عصر جدید کے موخرین کی تحقیقات بھی قرآنی نظریے کی تائید کرتی ہیں۔

قرآن اور اس کی پیشین گویاں

قرآن مجید نے جس وقت ۲۱۵ میں ایران نے روم کو شکست دی اور یہ امر قریش کی مسرت و خوشی کا باعث ہوا، تو پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہا کہ دس سال کے ہبہ ایت قلیل عرصے میں روم ایران کو شکست دے دے گا، اس واقعہ کے بارے میں بعض مسلمانوں اور بعض کافروں کے درمیان مشرود بندی ہو گئی۔ بعد میں ویسا ہی ہوا جیسا کہ قرآن نے خبر دی تھی، اسی طرح قرآن نے پورے قطع و یقین کے ساتھ خبر دی کہ جو شخص پیغمبر اکرم ﷺ کو ابتر (مقطوع النسل) کہتا ہے، وہ خود ہی مقطوع النسل ہے۔ اس وقت وہ شخص جس کے کئی بیٹے تھے، صرف دو تین نسلوں کے اندر تدریجیاً بالکل ختم ہو گئے۔ یہ ساری باتیں اس کتاب میں مجزہ ہونے کا پتہ دیتی ہیں، قرآن میں اور بھی علمی و معنوی مجرمات موجود ہیں، جو فلسفی، طبیعی اور تاریخی علوم سے مر بوط ہیں۔

لیتا ہے کیوں کہ وہ ایک غیر معمولی مقدس خیال و تصور کی صورت میں جسم ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

مسلمان فلاسفہ نے قرآن سے آشنا ہونے اور قرآنی مفاهیم و مطالب کو پیش کرنے کے نتیجے میں الہیات کی بحث کو اس عروج پر پہنچا دیا ہے۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ ایک اُمیٰ اور ناخواندہ شخص جس نے نہ تو کسی استاد کے پاس تعلیم حاصل کی اور نہ کسی مکتب میں گیا ہو اس حد تک الہیات میں ترقی کر جائے کہ افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفہ سے ہزاروں سال آگے بڑھ جائے؟

قرآن، تورات اور انجیل

قرآن نے تورات و انجیل کی تصدیق کی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ان کتابوں میں تحریف کی گئی ہے اور خائنوں کے ہاتھ ان کتابوں کی تحریف میں ملوث ہیں، قرآن نے الہیات، پیغمبروں کے واقعات اور چند دوسرے قواعد و ضوابط اور معینہ امور کے بارے میں ان دونوں کتابوں کی غلطیوں کی اصلاح اور تصحیح کی ہے، جس کا ایک نمونہ توضیح تھا کہ جس کا تذکرہ شجرہ ممنونہ اور خطائے آدم کے بارے میں ہم پہلے کر چکے ہیں۔ قرآن نے خدا کو ایسی چیزوں سے جیسے کشتی لڑنا اور پیغمبروں کو نامناسب باتوں کی طرف منسوب ہونے سے جو گذشتہ کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں، پاک و منزہ قرار دیا ہے اور یہ خود اس کتاب کی حقانیت کی ایک دلیل ہے۔

تاریخی واقعات اور قصے

قرآن مجید نے ایسے تاریخی واقعات اور قصے بیان کئے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے، خود پیغمبر بھی ان سے لعلم تھے:

تک پہنچنا چاہئے مثلاً آزادی کے ساتھ زندگی گزارنی چاہئے شجاع اور دلیر ہونا چاہئے مستقل اور مسلسل اپنے مقصد کی طرف گامزد رہنا چاہئے خود کو کامل کرنا چاہئے معاشرے کو عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے ایسے راستے پر چلنا چاہئے جس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہو۔

لیکن یہ تمام عنادین ایک خاص فاسدر کھتے ہیں جو ان کی توجیہ کرتا ہے یعنی اگر کوئی مکتب ایک قسم کے احکامات و قوانین پیش کرتا ہے تو اس کے لئے لازم و ضروری ہے کہ بہر حال ہستی کائنات معاشرے اور انسان کے بارے میں ایک طرح کے فسنے اور تصور کائنات پر انحصار کرے اور اس کا سہارا لے مثلاً چونکہ ہستی ایسی ہے اور انسان یا اس کا معاشرہ اسی طرح کا ہے لہذا ایسا ہونا چاہئے اور ویسا نہیں ہونا چاہئے۔

تصور کائنات یعنی دنیا انسان اور معاشرے کے بارے میں بہت سے انکار اور تفسیروں اور تجزیوں کا مجموعہ کہ دنیا اس طرح کی ہے یا ایسا قاعدہ رکھتی ہے اسی طرح ترقی کرتی ہے فلاں مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے یا نہیں کرتی اس کا کوئی مبداء ہے یا نہیں ہے اس کی کوئی انتہا ہے یا نہیں ہے مثلاً انسان ایسی فطرت اور طبیعت رکھتا ہے کسی خاص فطرت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے یا نہیں مختار اور آزاد ہے یا بجور ہے؟ طبیعت میں ایک منتخب واقعیت موجود ہے جس کو قرآن کے الفاظ میں ”اصطہفی کیا ہوا“ کہتے ہیں یا ایک اتفاقی واقع ہے یا تاریخ اور معاشرہ پر جن قوانین کی حکومت ہے وہ کون سے قوانین ہیں؟ آئینہ یا لوگی تصور کائنات پر قائم ہیں اور یہ کہ کیوں اس طرح یا اس طرح ہونا چاہئے یا کیوں اس طرح جینا یا جانا یا ہونا یا باننا چاہئے؟ اس عقیدہ کے تحت ہے کہ دنیا یا سماج یا انسان کے بارے میں اس کا عقیدہ اور نظریہ ایسا ہے۔ ہر مسلک اور ہر آئینہ یا لوگی (عقیدے) کی علت اس کے تصور کائنات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور دوسرے الفاظ میں آئینہ یا لوگی ”حکمت عملی“ کا نام ہے اور تصور کائنات ”حکمت نظری“

اسلام کی امتیازی خصوصیات

اسلام دین خدا کا نام ہے جو یکتا ہے تمام پیغمبر اسی کی تبلیغ کے لئے بھیج گئے ہیں اور سب نے اسی دین کی طرف دعوت دی ہے اس دین خدا کی جامع و کامل صورت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کی گئی اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور آج یہ دین اسی نام (اسلام) سے دنیا میں پہنچانا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات جن کی تبلیغ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے ہوئی دین خدا کی کامل و جامع صورت ہونے ہمیشہ کے لئے انسان کی رہنمائی کی وجہ سے خاص امتیازی خصوصیات کی حامل ہیں دوڑہ خاتمیت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ یہ تمام کی تمام خصوصیات اپنی مجموعی حیثیت میں گذشتہ ادوار میں جو بشر کے بچپنے کے دور تھے وجود میں نہیں آسکتی تھیں اور ان مشخصات و خصوصیات میں سے ہر ایک اسلامی تعلیمات کو پر کھنے کا معیار ہے اور ان میں سے ہر خصوصیت کے ذریعے کہ جو خود اسلامی تعلیمات کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ اگرچہ مہم ہی سہی لیکن بہر حال اسلام کے مجموعی خدو خال سے آشنای حاصل کی جاسکتی ہے نیز ان معیارات کے پیش نظر یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں تعلیم اسلامی ہے یا نہیں اگرچہ ہم اس بات کا دعویٰ تو نہیں کرتے کہ یہاں پر ان تمام معیارات کو جمع کر سکتے ہیں لیکن ہم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ حق الامکان ان سب کی ایک جامع صورت پیش کریں ہم جانتے ہیں کہ ہر مکتب ہر مسلک اور ہر نظریہ بشر کی نجات اور کمال سعادت کے لئے ایک قسم کے احکام و معیار پیش کرتا ہے جو ”یہ کرنا چاہئے“، ”یہ نہیں کرنا چاہئے“، ”یہ نہیں ہونا چاہئے“، ”یہ ہونا چاہئے“، جیسے جامع عنادین کے تحت فردا اور معاشرے کے لئے ہوتے ہیں فلاں راستے کو منتخب کرنا چاہئے یا فلاں

”اگر تو پلٹ آئے اور تیر ارخ مڑ جائے تو تیری آنکھیں دیکھیں گی کہ گھر کا نظام تو چل رہا ہے۔“ ورو درکشتی روی بریم روان ساحل یم را چو خود بینی دوان ”اگر تو بھری جہاز میں سوار سمندر میں روان ہو تو تجھے یوں لگے گا جیسے ساحل بھی تیرے ساتھ چل رہا ہے۔“

گر تو باشی تنگ دل از ملجم
تنگ بینی چو دنیا را ہمہ^۱
”اگر سخت جنگوں کے باعث تو پریشان ہو گیا ہو تو تجھے پوری دنیا پر پریشان دکھائی دے گی۔“

ور تو خوش باشی بہ کام دوستان
این جہان بنمایدت چون بوستان
”اگر دوستوں کی محبتوں کے باعث تو خوش ہو تو یہ دنیا تجھے گلشن نظر آئے گی۔“
چون تو عالم کا ایک حصہ ہے پس اے مہین یقیناً تو تمام دنیا کو اپنی طرح دیکھتا ہے۔“

ہر کہ را افعال دام و دو بود
بر کریمانش گمان بد بود
”جو بھی شخص حیوانوں اور درندوں کی سی عادتیں رکھتا ہو وہ کریم انسانوں کو بھی اپنے جیسا سمجھے گا۔“

کی قسم سے ہے حکمت عملی کی خاص نوع حکمت نظری کی خاص نوع پرمی ہے مثلاً سقراط کی حکمت عملی اس خاص نظریہ کی بنیاد پر ہے جو سقراط دنیا کے بارے میں رکھتا ہے اور یہی خاص نظریہ سقراط کی حکمت نظری ہے اسی طرح اپیکور (Epicure) (مشہور یونانی فلسفی) کی حکمت عملی کا رابطہ ہی اس کی حکمت نظری سے ہے اور اسی طرح دوسروں کا بھی پس آئیڈ یا لو جیز (نظریات) کیوں آپس میں مختلف ہیں؟ کیونکہ تصورات کا نات مختلف ہیں یعنی آئیڈ یا لو جی تصور کائنات کے تابع ہوتی ہے۔

دوسری طرف جہان بینی جسے جہان شناسی بھی کہا جاسکتا ہے کیوں مختلف ہوتی ہے؟ کیوں ایک مکتب دنیا کو اس طرح دیکھتا ہے اور دوسرادوسری طرح؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے بہت سے مفکرین جب اس منزل تک پہنچتے ہیں تو فوراً منزل اجتماعی اور طبقاتی حالت کا شناختہ درمیان میں لاکھڑا کرتے ہیں اور اس امر کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ طبقاتی موقع و محل اور صورت حال کے لحاظ سے ہر شخص کا علیحدہ علیحدہ ایک خاص زاویہ نگاہ ہوتا ہے اور وہی طبقاتی نظام ہر شخص کو ایک خاص قسم کی عینک کائنات کے مطالعہ کے لئے پہنادیتا ہے۔ انسان کا اپنے معاشرہ سے رابطہ ان چیزوں سے رابطہ جو معاشرے میں پیداوار اور تقسیم ہوتی ہیں ان کی پیدائش اور تقسیم کی کیفیت سے رابطہ اور اس کے نتیجے میں خود اس انسان کی محرومی و نامحرومی سے اس کے اعصاب اور اس کی روح و رواں میں عکس العمل پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی اندر وونی حالت ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس کی اندر وونی اور ذہنی خاص حالت اس کی فکر و نظر نتیجہ گیری اور چیزوں کے بارے میں اس کی قوت فیصلہ کو متاثر کرتی ہے۔

مولانا راوی کے بقول:

چون تو بر گردی و بر گرد سرت
خانہ را گردندہ بیند منظرت

چاہئے کسی کی نظر میں معرفت اور پچان کے مرحلے ایک طرح کے ہیں تو دوسرے کی نظر میں دوسری طرح کے عقل کا استعمال بعض کی نظر میں محدود ہے اور بعض کی نظر میں لامحدود معرفت کے سرچشمے کیا ہیں؟ اس کا کیا معیار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ ہر مکتب کا نظریہ اس کے تصور کا نات پر مبنی ہے اور اس کا تصور کا نات معرفت و پچان کے بارے میں اس کے نظریے پر مبنی ہے ہر آئینہ یا لوگی کا ترقی پانا اس کے تصور کا نات کے ترقی پانے سے وابستہ ہے اور اس کے تصور کا نات کا ترقی پانا اس کے علم و معرفت کے ترقی پانے پر منحصر ہے۔ درحقیقت ہر مکتب کی حکمت عملی اس کی حکمت نظری سے وابستہ ہے اور اس کی حکمت نظری اس کی منطق سے وابستہ ہے پس ہر مکتب کو چاہئے کہ پہلے مرحلے میں اپنی منطق کو معین و مشخص کرے اسلام اگرچہ ایک فلسفی مکتب نہیں ہے اور اس نے فلسفے اور فلسفہ کی زبان و اصطلاح میں لوگوں سے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ اسلام اپنی ایک مخصوص زبان رکھتا ہے جس سے عام طور سے تمام طبقے اپنے فہم و ادراک صلاحیت و استعداد کے مطابق بہرہ مند ہوتے ہیں لیکن اس نے اپنے مطالب کی گہرائیوں میں ان تمام مسائل کے بارے میں اپنا معاپیش کیا ہے (اور یہ بڑی حریت میں ڈالنے والی بات ہے)۔ اس طرح سے کہ اس کو فکر عملی کے "پلانٹ" کی صورت میں اور اس کی جہان یعنی کو حکمت نظری کی شکل میں اور اس کے نظریات کو علم معرفت کے باب میں ایک منطقی اصول کے طور پر پیش کیا جاستا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمیں اس مقام پر ایک اشارہ پر اکتفا کر کے آگے بڑھنا چاہئے (کیونکہ) اسلامی آئینہ یا لوگی جہان یعنی اور علم معرفت کی تدوین کے لئے خصوصاً اس بارے میں علماء اسلام خواہ وہ فقہاء یا حکماء و عرفاء اور دوسرے تمام صاحبین نظر کے گرائ قدر اور گرائ بہا نظریات کے منظر کئی بڑی بڑی جلدیوں کی ضرورت ہو گی یہاں ہم فقط ایک فہرست (اگرچہ ناقص ہی سہی) پیش کرتے ہیں ممکن ہے آئندہ کسی

اس نقطے نظر سے کوئی بھی شخص اپنے نظریے کو صحیح اور دوسروں کے نظریے کو غلط نہیں کہتا کیونکہ نظریہ ایک نسبی امر ہے اور ہر شخص کا نظریہ اس کے قدرتی اور اجتماعی ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہر شخص کے لئے وہی صحیح ہوتا ہے جسے وہ دیکھتا ہے لیکن باقی اتنی سادہ نہیں ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انسان کی فکر و نظر کافی حد تک اس کے ماحول کے زیر اثر ہوتی ہے اس میں کوئی کلام نہیں لیکن اس چیز سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کے لئے ایسا آزاد فکری مرکز موجود ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو ہر طرح کی اثر پذیری سے آزاد اور محفوظ رکھ سکتا ہے (اور جسے اسلام کی نظر میں "فطرت" کہا جاتا ہے)۔ البتہ کسی اور جگہ اس کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔
بالفرض اگر ہم انسان کی اصلاح اور اس کے استقلال کو یعنی اس کی حقیقت پسند نگاہ کو اس سے سلب کرنا چاہیں تو بھی جہان یعنی اور جہان شناسی کے مرحلے میں انسان کی سرزنش کرنا قبل از وقت ہو گا۔ ان فلاسفہ اور دانشوروں کے نزدیک جوان مسلموں کا نزدیک سے مطالعہ کرتے ہیں آج یہ بات مسلم ہے کہ جہان یعنی اور علم کا نات یا جہان شناسی سے متعلق نظریات کے رنگ ہونے کی اصل اور جڑ کو علم معرفت میں یعنی آج کل جسے نظریہ معرفت یا نظریہ شناخت کہا جاتا ہے اس میں تلاش کرنا چاہئے۔

اکثر فلاسفہ "علم معرفت" کی طرف متوجہ ہوئے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ "فلسفہ" علم کا نات کا نام نہیں ہے بلکہ علم معرفت کا نام فلسفہ ہے۔ یہ ہر ایک کا علم کا نات یا تصور کا نات مختلف ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تفصیل معرفت و شناخت سے متعلق نظریات مختلف ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ دنیا کو عقل کے ذریعے پہچانا چاہئے تو دوسرا کہتا ہے کہ دنیا کو حواس خمسہ کے ذریعے پہچانا چاہئے تیسرا کہتا ہے کہ نفس کی صفائی و پاکیزگی نورانیت قلب اور الہام کے ذریعے دنیا کو پہچانا

آئیوں میں زمین و آسمان کی ماہیت و طبیعت کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط

”(اے جبیب) کہہ دو! تم لوگ دیکھو اور غور و فکر کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا چیزیں ہیں اسی طرح گذشتہ قوموں کی تاریخ میں تعقل و تدبر کی طرف سبق حاصل کرنے کے لئے دعوت دی ہے۔“ (سورہ یونس آیت ۱۰۱)

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ إِهَا أَوْ أَذَانٌ يَسْمَعُونَ إِهَا

”کیا وہ لوگ زمین میں سفر نہیں کرتے (زمیں پر گزرے ہوئے لوگوں کے آثار نہیں دیکھتے) تاکہ ان کے دل ایسے ہو جائیں۔ جن سے وہ سمجھنے لگیں اور کان ایسے ہو جائیں۔ جن سے وہ سننے لگیں۔“ (سورہ حج آیت ۲۶)

اسی طرح قرآن عقل اور عقل کی فطری بنیادوں کو بھی معتبر جانتا ہے اور اپنے استدلالوں میں ان پر اعتماد کرتا ہے۔

قُلْ لَوْ كَانَ فِيهِمَا إِلَهٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا

”کہہ دو کہ اگر ان دونوں (آسمانوں و زمین تمام موجودات) میں ایک خدا کے سوا کئی خدا ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔“ (سورہ انبیاء آیت ۲۲)

اور ان کا نظام درہم برہم ہو جاتا (برہان تمان) یا پھر ارشاد ہوتا ہے:

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلِيٍّ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ إِذَا لَدَّهُبَ كُلُّ إِلَهٖ إِمَّا خَلَقَ وَلَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ طُسْبَحَ اللَّهُ عَمَّا يَصِفُونَ ⑥ (سورہ مومنوں آیت ۹۱)

موقع پر اس کی تکمیل ہو جائے۔ اس مقام پر جب کہ ہم اسلام کے مشخصات کے زیر عنوان اسلامی نظریات کے اصل خود خال نمایاں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں معرفت شناسی کے مشخصات جہاں مبنی اور جہاں شناسی کے مشخصات اور آئینہ یا لوگی سے متعلق مشخصات:

(الف) معرفت اور شناخت کا مسئلہ۔

کیا شناخت ممکن ہے؟ اس مسئلے سے متعلق یہ پہلا سوال ہے جو ہمیشہ درپیش رہا ہے اور ہے گا بہت سے دانش و رہیقی معرفت و شناخت کو ممکن سمجھتے ہیں اور انسان کو ان چیزوں کی واقعیت و حقیقت پہچاننے سے جو دنیا میں ہیں اور دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں قاصر سمجھتے ہیں اور یقین (یعنی قطعی و ناقابل تردید اور واقع کے مطابق علم) کو ایک اور محال شمار کرتے ہیں لیکن قرآن اس بناء پر کہ اس نے خدا دنیا انسان اور تاریخ کو پہچاننے کی دعوت دی ہے اور اس بناء پر کہ اس نے آدم اکے قصے میں جو ایک انسان کا قصہ ہے اور اس کو تمام اسمائے الہی (کائنات کے حقائق) کی تعلیم کے لائق جانا ہے اور اس بناء پر کہ اس نے بعض موقعوں پر علم پروردگار (جو عین حقیقت ہے) کے کسی جزوی حصے پر محیط اور حاوی ہونے کی نوع سے سمجھا ہے۔

وَلَا يُجِيِّطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

”یعنی معرفت و شناخت کو ممکن جانتا ہے۔“ (سورہ بقرہ آیت ۲۵۵)

۲۔ معرفت کے سرچشمے کیا ہیں؟ قرآن کریم کی نظر میں معرفت و شناخت کے سرچشمتوں سے مراد طبیعت یا آفاقی نشانیاں انسان یا نفسی نشانیاں تاریخ یا مختلف قوموں کے واقعات عقل و فطرت کے بنیادی اصول قلب یعنی دل صفائی و پاکیزگی کے لحاظ سے گذرے ہوئے لوگوں کے علمی اور تاریخی آثار ہیں۔ قرآن نے اپنی بہت سے

شکر ادا کرو اور ان سے کما حقد نفع حاصل کرو۔” (سورہ خلٰ آیت ۷۸)

اس آیہ کریمہ میں صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ انسان افلاطون کے نظریے کے بر عکس اپنے پیدا ہونے کے وقت ہر قسم کے علم و معرفت سے بے گانہ ہوتا ہے اور خدا نے انسان کو حواس عطا کئے ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے سے دنیا کا مطالعہ کرے اور اس کو ضمیر اور تجزیہ و تحلیل کی قوت عنایت فرمائی ہے تاکہ جن چیزوں کو وہ حواس کے ذریعے حاصل کرتا ہے اب دوسرے مرحلے میں ان پر غور و فکر کرے ان کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھے اور ان کی حقیقت کو اور ان قوانین کو جوان اشیاء پر حاکم ہیں معلوم کرے۔ اس آیت میں صاف صاف لفظوں میں حواس کو (جن میں کان اور آنکھ کا سب سے زیادہ اہم ہونے کی وجہ سے بطور نمونہ تذکرہ کیا گیا ہے) معرفت و شناخت کے وسائل (یعنی سطحی شناخت اور شناخت کا پہلا مرحلہ) اسی طرح ضمیر (دل) کو بھی معرفت و شناخت اور علم پیدا کرنے کے وسائل (یعنی منطقی اور عینیت معرفت کا مرحلہ) کے عنوان سے متعارف کروایا گیا ہے۔ اس آیت میں ضمناً شناخت کے بارے میں ایک دوسرے مسئلے کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ مراحل شناخت کا مسئلہ ہے۔

قرآن جس طرح حواس اور قوت فکر کو معرفت کے وسائل سمجھتا ہے اسی طرح تزکیہ نفس اور تقویٰ و پرہیز گاری کو بھی معرفت کا ایک وسیلہ سمجھتا ہے۔ بہت سی آیتوں میں انہی مطالب کی طرف اشارہ یا تصریح کی گئی ہے۔

إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَعْجَلُ لَكُمْ فُرْقَانًا (سورہ انفال آیت ۲۹)

”اگر تم اپنے آپ کو ان باتوں سے جو خدا کو پسند نہیں ہیں بچاؤ گے تو اپنے دل کو پاک و صاف اور محفوظ رکھو گے۔

تو خداوند عالم تمہارے واسطے حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کرنے کا

”خدا نے کوئی بیٹا اختیار نہیں کیا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرے خدا ہیں (کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی اپنی مخلوقات کو اپنے ساتھ مختلف سمتیوں میں لے جاتا اور ان خداوں میں سے بعض پر اپنی برتری جاتا۔ خدا پاک و منزہ ہے ان چیزوں سے جن سے لوگ اس کو متصف کرتے ہیں۔“

(نظام کائنات میں ہم آہنگی اور جہت و سمت کی وحدت پر مبنی برہان) اور اسی طرح قرآن قلب اور دل کو بعض الہی اہمات اور القیامت کا مرکز سمجھتا ہے۔ جو شخص جس قدر بھی اسے پاک و صاف کرنے اور پاکیزہ رکھنے اور خدا کی طرف متوجہ اور اخلاق و عبودیت میں خاص توجہ کے ذریعے اس کو معنوی و روحانی غذا پہنچانے کی کوشش کرتا رہے گا اتنا ہی اہمات والوں کے ایک سلسلے سے بہرہ مند ہوتا رہے گا۔ انبیاء اکی وہی اسی طرح کی معرفت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

جس طرح سے قرآن نے قلم و کتاب اور تحریر کی قدر و قیمت کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے اور کئی موقعوں پر ان چیزوں کی قسم کھائی ہے۔

وَالْقَلْمَ وَمَا يَسْطُرُونَ ﴿١﴾ (سورہ قلم آیت ۱)

۳۔ شناخت و معرفت کے وسائل کیا ہیں؟ معرفت و شناخت کے وسائل سے مراد قوت تفکر و استدلال نفس کی پاکیزگی اور دوسرے لوگوں کے علمی آثار ہیں۔

سورہ مبارکہ خلٰ میں ارشاد خداوندی ہے:

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُونِ أُمَّهَتُكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ۚ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأُفْدَةَ ۖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾

”خدا نے تمہیں تمہاری ماوں کے شکمبوں سے باہر نکلا اس حالت میں کتم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہیں کان آنکھ و دل عطا کئے تاکہ تم ان نعمتوں کا

شناخت کے موضوعات:

کون سی چیزیں پہچاننے کے لائق ہیں جنہیں پہچانا چاہئے؟ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو قابل معرفت ہیں اور ان کی معرفت حاصل کرنا چاہئے۔

(ب) تصور کائنات کے لحاظ سے

یہ کتاب جو اسلامی والہی تصور کائنات کا ایک مقدمہ ہے اس کا اصل مقصد اسی مطلب کی توضیح کرنا ہے اور اس کتاب کے مطالب کے ضمن میں ان نکات کو بھی سمجھا جاسکتا ہے لیکن اس لحاظ سے کہ مضمون کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ ان مشخصات کو بہت مختصر اور خلاصہ کے طور پر ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

۱۔ کائنات "اسی کی طرف سے" ہونے کی اہمیت رکھتی ہے یعنی دنیا کی حقیقت وجودی اسی کی طرف سے دی گئی حقیقت و موجودگی ہے کسی چیز کے سے ہونے میں اس لحاظ سے کہ اس کا تمام وجود اسی کی طرف سے عطا کردہ حقیقت اور واقعیت نہیں ہے فرق ہے جیسے فرزند کا وجود مال باپ کی نسبت کہ فرزند کا وجود ان کے وجود سے ہے لیکن اس کی وجودی حقیقت مال باپ کی طرف نسبت اور اضافی حقیقت سے اختلاف رکھتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام حقیقت خدا سے منسوب ہے۔ اس کی حقیقت اور اللہ سے اس کی اضافت و نسبت سب ایک ہے مخلوق ہونے کے یہی معنی ہیں اگر اس معنی کے علاوہ ہو گا تو وہ تولید ہو گی نہ کہ تخلیق اور اس کی ذات "لم یلد و لم یولد" ہے اور اس صورت میں دنیا زمانی آغاز و انجام رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر دنیا زمانی آغاز رکھتی ہو تو "اس سے ہونے" کی حقیقت محدود ہے اور اگر نہیں رکھتی تو "اس سے ہونے" کی حقیقت لامحدود ہے۔ زمانی طور پر

ایک ذریعہ معین فرمائے گا۔"

وَنَفِّيْسٌ وَمَا سُؤْلَهَا ۝ فَالْهَمَّهَا الْجُوَرَهَا وَتَقْوِيَهَا ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ۝

"قسم ہے انسان کی جان کی اور اس کی آرائشی اور اعتدال کی کہ خدا نے اسے اس کی ناپاکی اور پاکی کے بارے میں الہام کیا ہے اور اس کو سمجھا یا ہے جس شخص نے اس کا ترکیہ کیا اس نے فلاج پائی اور جس نے اس کو آلو دہ کیا وہ ناکام ہوا۔" (سورہ شمس آیت ۷۔ ۱۰)

علم حاصل کرنا یاد کرنا کتاب کو پڑھنا بھی ان وسیلیوں میں سے ہے کہ اسلامی تعلیمات نے اس کی طرف توجہ کی ہے اور اس کو باقاعدہ طور پر ایک خاص اہمیت دی ہے اس کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ پیغمبر پروری کا آغاز لفظ "اقراء" یعنی پڑھو سے ہوتا ہے۔ قرات یعنی (کتاب سے) کسی عبارت کا پڑھنا ہے۔

إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ إِقْرَأْ وَرَبِّكَ الْأَكْرَمِ ۝ الَّذِي عَلَمَ بِالْقَلْمَنِ ۝ عَلَمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

"اے رسول پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا (یا اس حیوان سے جو جونک سے مشابہ ہوتا ہے) پڑھو اور تمہارا سب سے زیادہ کریم (و بزرگ) پروردگار ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا انسان کو وہ باتیں پڑھادیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔" (سورہ علق آیت ۱۔ ۵)

”اسی کی طرف“ صعودی سفر طے کرنے کی حالت میں ہے۔ سب کے سب خدا کی طرف سے آئے ہیں اور سب کو اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

إِنَّا لِهُوَ إِلَيْهِ رِجُुونَ ﴿١٥٦﴾ (سورہ بقرہ آیت ۱۵۶)

أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ ﴿٥٣﴾ (سورہ شوریٰ آیت ۵۳)

”آگاہ ہو جاؤ کہ تمام امور کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہو گی۔“

إِلَى رَبِّكَ مُمْتَهِنَاهَا ﴿٢٣﴾ (سورہ النازعات آیت ۲۳)

”بے شک ان چیزوں کی انتہا تمہارے پروردگار کی طرف ہو گی۔“

۵۔ دنیا ایک علت و معلول اور سبب و مسبب کے نظام میں بندھی ہوئی ہے اور ہر موجود پر الہی فیض اور اس کی قضا و قدر صرف اسی کے خاص علل و اسباب کی راہ سے جاری ہوتی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں مولف کی کتاب ”عدل الہی انسان اور سرنوشت“)

۶۔ علت و معلول اسباب و مسببات کا یہ نظام مادی و جسمانی اسباب و مسببات پر محصر نہیں ہے۔ دنیا میں علل و اسباب کا نظام اپنی مادی جہت کے اعتبار سے ماوراء حیثیت کا حامل ہے اپنی ملکوتی و معنوی جہت سے غیر مادی علل و اسباب کا نظام رکھتی ہے اور ان دونوں نظاموں کے درمیان کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا وجودی مرتبہ اور درجہ حاصل کر لیا ہے۔ فرشتے لوح لوح و قلم آسمانی و ملکوتی کتابیں ایسے واسطے اور وسیلے ہیں جن کے ذریعے باذن پروردگار الہی فیض جاری ہوتا ہے۔

۷۔ دنیا پر ایسے مستقل اور ناقابل تبدیل قوانین کی حکمرانی ہے جو دنیا کے سببی و مسببی نظام کا لازمہ ہے۔

محدو دہونا اور لا محدود دہونا کسی مخلوق کی واقعیت و موجودگی اور اس کی تخلیق میں کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔

۲۔ دنیا جس کی واقعیت و تخلیق ”اس سے ہے“ سے عبارت ہے اور اصطلاح میں حادث ذاتی کہلاتی ہے۔ ایک حدوث زمانی بھی رکھتی ہے یعنی ایک بدلتی رہنے والی اور متحرک واقعیت بلکہ عین حرکت ہے اور جب دنیا عین حرکت اور خود حرکت ہے تو ایک حدوث مسلسل ہے یعنی دنیا ہمیشہ اور دائیٰ طور پر خلق ہونے اور حدوث و فنا کی حالت میں ہے۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں دنیا بیدا اور فنا نہ ہوتی ہو۔

۳۔ اس دنیا کے حقائق دوسری دنیا جسے عالم ڈیب کہا جاتا ہے کہ واقعیات کی تنزل یافتہ صورت ہے اور دوسرے درجہ اور مرتبے کی واقعیات ہیں جو چیزیں اس دنیا میں خاص تعداد میں اور محدود ہیں وہ پہلے سے موجود عالم (غیب) میں خاص تعداد کے بغیر اور غیر محدود شکل میں ہیں اور قرآن کے الفاظ میں خزانہ کی شکل میں موجود ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں تفسیر لمیز ان میں آئیہ کریمہ: ”وَعَدْهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَهٌ“ کی تفسیر انعام (۲۰۰)

وَإِنْ مَنْ شَئَ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ﴿۲﴾

”کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ اس کے خزانے اور معاون ہمارے پاس موجود ہیں اور ہم ان کو نازل نہیں کرتے مگر بقدر معین۔“ (سورہ الحج آیت ۲۱)

۴۔ یہ دنیا ”بے سوئے اوئی“ یعنی اسی کی طرف لوٹ کر جانے کی مابہیت رکھتی ہے یعنی جس طرح ”اس سے ہے“ اسی طرف ”اسی کی طرف“ بھی ہے پس پوری دنیا اپنے تمام موجودات کے ہمراہ ایک (اسی کی طرف سے) نزولی سفر طے کرچکی ہے اور اب

جز اوس زادا و مکافاتہ کا نظام جاری ہے۔ شکر و کفر دونوں یکساں نہیں ہیں۔“
 لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَرِيدُنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابَ لَشَدِيدٌ^۷
 ”اگر تم لوگ الہی نعمتوں کی قدر دانی اور حق شناسی کرو گے اور مطلوبہ طریقے
 سے ان سے فائدہ اٹھاؤ گے تو ہم ان نعمتوں کو تم پر اور زیادہ کر دیں گے اور
 ناشکری کرو گے اور ان نعمتوں کو بے ہودہ طریقے سے اور مختلف راہ میں
 صرف کرو گے تو میرا عذاب بے شک بہت سخت ہے۔“ (سورہ ابراہیم
 آیت ۷)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

لَا يَزَهَدُنَكُ فِي الْمَعْرُوفِ مِنْ لَا يَشْكُرُكُ عَلَيْهِ فَقَدْ يَشْكُرُكُ
 مِنْ لَا يَسْتَتِمُ بِشَئِيْ مِنْهُ وَقَدْ تَرَكَ مِنْ شَكَرَ الشَاكِرَ اكْثَرَ
 هَمَّا اضَاعَ الْكَافِرُ وَاللَّهُ يَحْبُبُ الْمُحْسِنِينَ (نهج البلاغہ حکیمت
 نمبر ۲۰۰)

”اگر تم نے کسی کے ساتھ بھلانی کی اور اس نے تمہاری حق شناسی نہ کی تو کہیں
 اس کی یہ حرکت تمہیں بھلانی کرنے سے بدلت نہ کر دے کیونکہ اس کی بجائے
 تمہاری حق شناسی وہ کرے کا جو تمہاری بھلانی سے قطعاً بھی بہرمند نہیں ہوتا
 اور تم اس غیر شکرگزار کی طرف سے اس مقدار سے کہیں زیادہ پاجاؤ گے جتنا
 اس کفران نعمت کرنے والے نے تمہارے حق نعمت کو ضائع کیا ہے اور اللہ
 احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے یعنی دنیا اپنی مجموعی حیثیت میں ایک
 باہم وابستہ کارخانہ اور ایک عضویاتی رابطے کی حامل ہے تم اس انتظار میں نہ

۸۔ دنیا ایک ہدایت یافتہ حقیقت ہے۔ دنیا کی ترقی اور تکامل ہدایت یافتہ
 تکامل ہے۔ دنیا کے تمام ذرات جس درجہ و مرتبہ کے بھی ہیں نور ہدایت سے فیض
 یا ب ہیں جبلت (فطری شعور) حس عقل الہام اور وحی یہ سب دنیا کے ہدایت عامہ
 کے مراتب و مدارج ہیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَئِيْ خَلْقَةٍ ثُمَّ هَلَى^۸ (سورہ طہ
 آیت ۵۰)

”موسیٰ اور ہارونؑ اے فرعون سے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے
 ہر چیز کو اس کے لائق خلقت عطا کی ہے پھر اس کی ہدایت بھی کی۔“

دنیا میں خیر میں خیر بھی ہے اور شر بھی مطابقت وہم آہنگی بھی ہے اور مختلف
 بھی جو دو سخا بھی ہے اور بخیل و کنجوی بھی نور بھی ہے اور تاریکی بھی دنیا حرکت و ترقی کی
 حالت میں بھی ہے اور سکون و جمود کی حالت میں بھی لیکن جو چیز حقیقی معنی میں وجود رکھتی
 ہے وہ خیر ہے مطابقت و متوافق ہے جو دو سخا ہے نور ہے حرکت ہے۔

۹۔ شر تضاد بدی تاریکی اور جو د طفیل موجودات ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ
 یہ طفیل امور عموماً نیکیوں کا دروازہ کھولنے کا میا بیوں بخششوں روشنیوں حرکتوں اور
 ترقیوں میں ایک بنیادی کردار کے حامل بھی ہیں۔

۱۰۔ کائنات چونکہ ایک زندہ اکائی ہے یعنی ذی شعور قوتیں دنیا کی تدبیر
 کرتی ہیں۔

فالیم برات امراء (سورہ النازعات آیت ۵) ”اپنے اور انسان کے
 درمیان رابطے اور تعلق کے لحاظ سے عمل اور رد عمل کی دنیا ہے یعنی انسان کے نیک و بد
 ہونے کے بارے میں لا پرواہ نہیں ہے۔ آخرت میں جزا و سزا کے علاوہ دنیا میں بھی

اور کسی زمانے میں انسانیت معاویہ بن جانے میں ہو بلکہ جن اصولوں کی بناء پر ابوذر ابوذر ہیں اور معاویہ معاویہ موئی ہیں اور فرعون فرعون ہے وہ ہمیشہ رہنے والے اور غیر متغیر اصول ہیں۔

۱۲۔ حقیقت بھی ابدی اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ایک علمی حقیقت اگر پورے طور پر حقیقت ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے حقیقت ہے اور اگر وہ حقیقت بطور لکلی خطا ہے تو ہمیشہ کے لئے خطا ہے اگر کسی کا ایک جزو حقیقت ہے اور دوسرا جزو خطا ہے تو جو جزو حقیقت ہے وہ ہمیشہ کے لئے حقیقت ہے اور جو جزو خطا ہے وہ ہمیشہ کے لئے خطا ہے اور ہو گا اور جو چیز متغیر و متبدل ہوتی ہے وہ واقعیت ہے اور وہ مادی واقعیت ہے لیکن حقیقت یعنی انسان کے فکری تصورات اور ذہنی افکار واقعیت سے منطبق ہونے اور منطبق نہ ہونے کے لحاظ سے ایک ثابت و قائم اور یکساں حالت رکھتے ہیں۔

۱۵۔ دنیا اور زمین و آسمان حق و عدالت کے ساتھ قائم ہیں۔

۱۴۔ مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ (سورہ احقاف آیت ۳)

”ہم نے آسانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جوان دنوں کے درمیان ہیں نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ۔“

۱۶۔ اس دنیا میں الہی منت باطل کے خلاف حق کی آخری فتح و کامیابی پر منحصر ہے حق اور اہل حق غالب اور ظفر مند ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتَنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَلِيبُونَ ۝ (سورہ الصافات آیت ۱۴، ۱۵)

رہوا اور یہ امید نہ رکھو کہ تم نے جس جگہ بھلائی کی ہے وہیں سے تم کو نیکی کا بدلہ بھی ملے گا کبھی کبھی بلکہ زیادہ تر تم جس جگہ پر نیکی کرتے ہو اس کا بدلہ کسی دوسری جگہ سے ملتا ہے جہاں سے تمہیں کوئی امید نہیں ہوتی کیوں؟ کیونکہ اس دنیا کا ایک خدا ہے اور خدا نیک کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

تو نیکی بکن و در جملہ انداز کہ ایزد در بیانات وحدہ باز ”تم نیکی کرتے رہوا اور ان سب کو در جملہ میں ڈال دوتا کہ خداوند عالم تمہیں صحراء میں اس کا بدلہ دے۔“

۱۱۔ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا ہے جو ابدی اور جزا اوسرا کی دنیا ہے۔ انسان کی روح ایک جاودا نی حقیقت ہے۔ انسان قیامت میں صرف ایک زندہ صورت میں ہی محصور نہیں کیا جائے گا بلکہ دنیاوی موت اور قیامت کے درمیان بھی ایک منزل کا فاصلہ ہے جس میں انسان ایک قسم کی زندگی سے جس کو بر زخی زندگی کہا جاتا ہے اور جو دنیوی زندگی سے زیادہ قوی اور زیادہ کامل ہے بہرہ مندرجہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تقریباً ۲۰ آیتیں انسان کی موت اور قیامت کے درمیان کی مدت اور جسم انسانی کے بوسیدہ ہو کر خاک ہو جانے کی حالت میں بھی انسان کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۳۔ زندگی اور اس کے بنیادی اصول یعنی انسانیت اور اخلاق کے اصول ابدی اور ناقابل تغیر اصول ہیں اور جو قواعد تغیر اور نسبی ہیں وہ فروعی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انسانیت کسی زمانے میں کوئی چیز ہو اور دوسرے زمانے میں کوئی دوسری چیز بن جائے جو پہلے کی نسبت بالکل مختلف ہو مثلاً کسی زمانے میں انسانیت ابوذر ہونے میں ہو

وہ بدرتین انسان ہی کیوں نہ ہو) تو بہ اور راہ راست کی طرف اس کی واپسی اور نصیحت قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اسی لئے انبیاءؐ الہی اس بات پر مامور ہیں کہ حتیٰ بدرتین افراد اور اپنے دشمنوں میں سے سخت ترین دشمن کو بھی ابتدائی مرحلے میں وعظ و نصیحت کریں اور اس کی انسانی فطرت کو بیدار کریں لپک اگر یہ چیز فائدہ مند نہ ہو تو پھر ان سے مقابلہ و جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس پہلی مرتبہ جاتے وقت یہ وصیت کی گئی کہ
هُلْ لَكَ إِلَى آنَ تَرَّكِيٗ وَأَهْدِيَكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَتَحَشِّيٗ ⑯ (سورہ النازعات آیت ۱۸-۱۹)

”کہہ دو کہ کیا تو اپنے کونجاست کفر سے پاک کرنے پر آمادہ ہے؟ اور کیا میں تجھے تیرے پر در دگار کی راہ بتاؤں تاکہ تو اس سے ڈرے؟“
 ۲۰۔ انسان ایک حقیقی مرکب اور حقیقی اکائی ہونے کے باوجود قدرتی جمادی اور باتاتی مرکبات کے برخلاف (کہ ترکیب کی حالت میں) جس کے ترکیب دینے والے عناصر جو اپنی ہویت اور مستقل حیثیت کھود دیتے ہیں اور ان کا باہمی تضاد اور نکراہ مکمل طور پر ملائیت اور ہم آہنگی میں تبدل ہو جاتا ہے انسان کی خلقت میں جو متصاد عناصر استعمال ہوئے ہیں اپنی ہویت کو اور ذاتی حیثیت کو مکمل طور پر نہیں کھود دیتے اور ہمیشہ ایک اندر وہی کشمکش انہیں ایک طرف سے دوسری طرف لے جاتی ہے یہ اندر وہی تضاد ہے جسے دین کی زبان میں عقل و جہل یا عقل و نفس یا روح و بدن کا تضاد کہا جاتا ہے۔

۲۱۔ چونکہ انسان مستقل روحانی جوہر کا مالک ہے اور اس کا ارادہ اس کی روحانی حقیقت کے سرچشمے سے پیدا ہوتا ہے لہذا مختار و آزاد ہے کوئی جریا کوئی ذاتی

”ہماری قضا اور ہمارا فیصلہ اس امر پر ہو چکا ہے کہ ہمارے پیغمبر بے شک منصور و ظفر مند ہیں اور بے شک ہماری نوج (الشحر) غالب و فاتح ہے۔“

۷۔ تمام انسان خلقت کے اعتبار سے برابر پیدا کئے گئے ہیں۔ کوئی انسان پیدائش کے اعتبار سے دوسرے انسان پر فوقيت نہیں رکھتا۔ بزرگی اور فضیلت تین چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے:

قلم: قُلْ هُلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۶ (سورہ زمر آیت ۶)

راہ خدا میں جہاد: ”وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَعْدِينَ أَجَرًا عَظِيمًا“ ۴۵ (سورہ النساء آیت ۹۵)

تقویٰ و پاکیزگی: ”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَلَكُمْ“ (سورہ حجرات آیت ۱۳۰)

۱۸۔ اصل خلقت کے اعتبار سے انسان بہت سی فطری صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے ان میں دینی اور اخلاقی فطرت بھی ہے انسان کے ضمیر و وجدان کا اصلی سرمایہ اس کی خداداد فطرت ہے نہ کہ طبقاتی محل و مقام یا اجتماعی زندگی یا طبیعت کے ساتھ زور آزمائی کیونکہ یہ سب انسان کے اکتسابی وجدان (ضمیر) میں موثر ہوتے ہیں انسان اپنی انسانی فطرت کے لحاظ سے منفرد ثقافت اور آئینہ یا لوگی کا مالک بن سکتا ہے اس کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ قدرتی ماحول اجتماعی ماحول تاریخی اسباب و عوامل اور اپنے وراثتی عوامل کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہو اور اپنے کو ان سب کی قید سے آزاد کر لے۔

۱۹۔ چونکہ ہر فرد بشرطی طور پر انسان پیدا ہوتا ہے ہر انسان میں (اگرچہ

۲۵۔ چونکہ دنیا کا صدور ایک مبداء سے ہوا ہے اور اسے ایک متناسب اور ہم آہنگ رفتار میں اسی کی طرف واپس جانا ہوگا اور چونکہ مدبر اور باشور قوت کی تدبیر کے تحت اپنی حرکت اور رفتار کو جاری رکھئے ہے لہذا ایک قسم کی وحدت کی حامل ہے ایسی وحدت جو زندہ موجود کی عضوی وحدت سے مشابہ ہے۔

(ج) آئینہٗ یالوجی کے لحاظ سے اسلام کی خصوصیات

اسلام کی امتیازی خصوصیات کا بیان آئینہٗ یالوجی کے لحاظ سے خاص کر آئینہٗ یالوجی کی وسعت کے لحاظ سے خواہ کلی مشخصات کے اعتبار سے ہو یا آئینہٗ یالوجی کی ہرشاخ کی خصوصیات کے لحاظ سے بہت مشکل ہے پھر بھی ہم اس اصول کی بناء پر کہ اگر کسی چیز کو مکمل طور پر حاصل نہ کیا جا سکے تو جتنا حاصل کیا جا سکے اسی کو لے لینا چاہئے جو کچھ اس موقع پر فی الحال ہمارے لئے ممکن ہے اس کی ایک فہرست پر نظر ڈال
رہے ہیں:

۱۔ کمال و ارتقاء

ہمہ گیر حیثیت اور کمال و ارتقاء دوسرے ادیان کے مقابلے میں اسلام کے من جملہ امتیازات میں سے ہے اور زیادہ بہتر الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ دین خدا کی ابتدائی صورتوں کی نسبت اس کی مکمل اور جامع صورت کی خصوصیات میں سے اس کی ایک جامعیت اور ہمہ گیر حیثیت ہے۔ اسلام کے چار آخذ یعنی قرآن سنت اجماع اور عقل اس امر کے لئے کافی ہیں کہ علمائے امت ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریہ معلوم کر سکیں۔ علمائے اسلام کسی موضوع کو بلا حکم نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزد یک اسلام میں ہر چیز کے لئے ایک حکم موجود ہے۔

احتیاج اس کی آزادی اور اس کے اختیار کو اس سے چھین نہیں سکتی اس لئے وہ اپنا بھی جواب دے ہے اور اپنے معاشرے کا بھی ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔

۲۲۔ انسانی معاشرہ بھی فرد بشر ہی کی طرح ایک حقیقی مرکب ہے اور اپنے قوانین روایات اور نظام رکھتا ہے اور اپنی مجموعی حیثیت میں پوری تاریخ میں کبھی کسی خاص انسان کے ارادے کا تابع نہیں رہا ہے اور اپنے وجود میں (فکری نوعی سیاسی اور اقتصادی گروہوں پر مشتمل) مقتضاد عناصر کے باوجود مکمل طور پر اپنی ہویت کو نہیں کھویا ہے) سیاسی اقتصادی فکری اور اعتمادی جنگ کی صورت میں مقابلہ آ رائی اور بالآخر رشد و ہدایت پانے والے انسانی کمال پر پہنچنے والے انسانوں کی بلند و برتر خواہشات اور میلانات اور حیوان صفت انسانوں کی پست خواہشات کے درمیان جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک معاشرہ انسانیت کے بام و عروج تک نہیں پہنچ جاتا۔

۲۳۔ خداوند عالم کسی انسان یا کسی قوم کی سرنوشت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ آدمی یا وہ قوم خود اپنے حالات کو نہ بدلتے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۝ (سورہ

رعد آیت ۱۱)

۲۴۔ خداوند عالم جو انسان اور سارے جہان کا پیدا کرنے والا ہے غنی بالذات ہے تمام جہات سے بسیط ہے کامل مطلق ہے کسی چیز کا منتظر نہیں ہے اس میں حرکت و ارتقاء محال ہے اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں ساری دنیا اسی کی بنائی ہوئی ہے۔ ساری سطح زمین اسی کے ارادے و مشیت کی مظہر ہے اس کے ارادے کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہر ارادہ اور مشیت اس کے ارادے کے تابع ہے اس کے برابر نہیں ہے۔

مقابلہ کیا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ فرماتے ہیں:

لارہبانیۃ فی الاسلام

”اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔“

پرانے معاشرے میں دو چیزوں میں سے ایک چیز ہمیشہ موجود رہی ہے یا صرف آخرت کی طرف رغبت اور دنیا سے فرار یا صرف دنیا کی طرف رغبت اور آخرت سے گریز (تمدن اور ترقی و توسعہ) اسلام نے انسان میں زندگی کی طرف رغبت کے ساتھ ساتھ آخرت کا شوق بھی رکھا ہے۔ اسلام کی نظر میں آخرت کا راستہ زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔

۵۔ اجتماعی ہونا:

اسلامی قوانین اور احکام اجتماعی ماہیت کے حامل ہیں یہاں تک کہ وہ احکام جو زیادہ سے زیادہ انفرادی ہیں جیسے نمازو، روزہ وغیرہ اس میں بھی ایک اجتماعی اور سماجی حسن پیدا کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے بہت سے اجتماعی سیاسی اقتصادی اور عدالتی قوانین و احکام اسی خاصیت کے حامل ہیں جیسا کہ جہاد اور امر بالمعروف و نبی عن المکر کا تعلق اسلام اور اجتماعی ذمہ داری سے ہے۔

۶۔ انفرادی حقوق اور آزادی:

اسلام جہاں ایک اجتماعی دین ہے اور پورے معاشرے پر اس کی نظر رہتی ہے اور فرد کو معاشرہ کا ذمہ دار سمجھتا ہے وہاں فرد کی آزادی اور اس کے حقوق سے چشم پوشی بھی نہیں کرتا اور فرد کو فرعی حیثیت نہیں دیتا بلکہ اسلام نے فرد کے لئے سیاسی اقتصادی قانونی اور اجتماعی حقوق رکھے ہیں۔

۲۔ اجتہاد قبول کرنے کی صلاحیت:

اسلامی کلیات کو اس طرح سے منظم کیا گیا ہے کہ ان میں اجتہاد قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اجتہاد یعنی کلی و ثابت اصول کو جزوی اور بدلتے رہنے والے مسائل و امور پر منطبق کرنا اسلامی کلیات کو اس طرح منظم شکل دینے کے علاوہ کہ جس کی وجہ سے ان میں اجتہاد کو قبول کرنے کی خاصیت پیدا ہو گئی ہے اسلامی سرچشمہ اور آمادزوں کی فہرست میں عقول کی موجودگی نے حقیقی اجتہاد کے کام کو آسان کر دیا ہے۔

۳۔ سہولت اور آسانی:

رسول اکرم کے الفاظ میں اسلام ”شریعت سمجھ سہلہ“ ہے۔ ہاتھ پاؤں باندھ دینے والی مشقت میں ڈالنے والی بے حد پریشان کرنے والی تکالیف شریعہ عائد نہیں کی گئی ہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الِّذِينَ مِنْ حَرَجٍ ۚ (سورہ حج آیت، ۸)

”خدا نے تمہارے لئے دین میں تنگی اور دشواری قرار نہیں دی ہے۔“

اور اس بناء پر کہ ”سمح“ (درگذر کے ہمراہ ہے) جہاں بھی اس حکم شرع کا انجام دینا تنگی اور دشواری اور شدید زحمت کا باعث ہو وہاں وہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔

۴۔ زندگی کی طرف میلان و رغبت:

اسلام زندگی کی طرف مائل اور راغب کرنے والا دین ہے نہ کہ زندگی سے دور کرنے کا باعث اور اسی لئے اس نے رہبانیت یعنی ترک دنیا سے سختی کے ساتھ

۹۔ مضر حکم کا نہ ہونا:

اسلامی قوانین اور احکام جو مطلق اور عام ہیں اس حد تک ان پر عمل جائز ہے جہاں تک کسی ضرر و فضنان کا باعث نہ ہو قاعدہ ضررا یک کلی قاعدہ ہے جو ہر اس قانون کے اجراء کے موقع پر ”ویسو“ یعنی ”تینج“ کا حق رکھتا ہے جب وہ ضرر و فضنان کا باعث ہو۔

۱۰۔ مفید نتیجے اور فائدے کی امتیازی حیثیت:

اسلام کی نظر میں ہر کام خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی سب سے پہلے اس کے فائدے اور مفید نتیجے کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ جس کام سے کوئی فائدہ برآمدہ ہو اسلام کی نظر میں اسے بے ہودہ فضول اور ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ **وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرُضُونَ** (سورہ مومونون آیت ۳)

۱۱۔ لیکن دین میں خیر و صلاح کا لحاظ:

مال و دولت کی گردش اس کے نقل و انتقال کو ہر قسم کی بے ہودگی اور بد عنوانی سے پاک و صاف ہونا چاہئے۔ ہر نقل و انتقال کے مقابل میں کوئی مادی یا معنوی خیر و بھلائی ملحوظ خاطر ہونی چاہئے ورنہ مال کی گردش باطل اور ممنوع ہو گی۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَ الْكُفَّارِ بَيْنَ كُفُّارٍ بِالْبَاطِلِ (سورہ بقرہ آیت ۱۸۸)

”جوئے وغیرہ کے ذریعے مال کا نقل و انتقال باطل طریقے سے مال کمانے کا مصدقہ ہے اور حرام ہے۔“

سیاسی لحاظ سے مشورے اور انتخاب کا حق فرد کو حاصل ہے اقتصادی لحاظ سے اپنے کام کے ماحصل اور حق محنت پر مالکیت کا حق معاوضہ اور متبادلہ صدقہ وقف ہبہ اجارہ مزارعہ اور مضاربہ وغیرہ کا حق اپنی جائز ملکیت میں رکھتا ہے قانونی لحاظ سے اسے دعویٰ دائر کرنے اپنا حق ثابت کرنے اور گواہی دینے کے حقوق دیئے گئے ہیں اور اجتماعی لحاظ سے اسے کام اور جائے سکونت کے انتخاب کا حق تحصیل علم میں مضمون کے انتخاب وغیرہ کا حق اور گھریلو زندگی میں اپنی شریک حیات کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔

۷۔ معاشرتی اور اجتماعی حق کی انفرادی حق پر فوقیت:

جس جگہ اجتماعی اور انفرادی حق کے درمیان تزاحم اور تضاد پیدا ہوتا ہے وہاں اجتماعی اور معاشرے کا حق انفرادی حق پر مقدم ہوتا ہے اسی طرح عام حق خاص حق پر فوقیت رکھتا ہے۔ البتہ ان موارد کی تشخیص خود حاکم شرع کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

۸۔ شوریٰ کا حصول:

اجتماعی نظام میں اسلامی نقطہ نظر سے شوریٰ کی حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ جن مقامات پر اسلام کی طرف سے کوئی صریح حکم نہیں آیا ہے وہاں مسلمانوں کو چاہئے کہ اجتماعی غور و فکر اور باہمی مشورے سے عمل کریں۔

عبارت میں ہے وہ ”بیج غرری“ ہے لیکن اجتہادی معیارات مطلقہ طور پر غرروفریب کو منوع قرار دیتے ہیں۔ (مؤلف)

۱۵۔ خلاف ارادہ امور سے مقابلہ:

جس طرح عقل قابل احترام اور اسلامی تعلیمات میں بہت سے احکام عقل کی حفاظت و نگہبانی کے لئے ہیں اسی طرح ارادہ بھی جو عقل کی قوت مجریہ ہے قابل احترام ہے اس لحاظ سے ارادے (خیر) سے روکنے والی چیزیں جوزبان اسلام میں لہو و لعب کھلاتی ہیں بھی حرام و منوع ہیں۔

۱۶۔ کام اور مشغله:

اسلام بیکاری اور کاہلی کا دشمن ہے اس لحاظ سے کہ انسان معاشرے سے استفادہ کرتا ہے کام فردا اور معاشرے دونوں کی اصلاح کا بہترین عامل اور سبب ہے اور بیکاری تباہی و فساد کا سب سے بڑا عامل ہے۔ اس لئے انسان کو مفید کام انجام دینے چاہیں۔ اسلام طیلی ہونے اور معاشرے پر بوجھ بننے کی سخت نہت کرتا ہے اور معاشرے پر بوجھ بننے والے پر لعنت کرتا ہے:

ملعون من القى كله على الناس
”وَخُنْضُ جوَايْنَا بِوَجْهِ الْوَكُوْنِ“
(وسائل ج ۱۲ ص ۱۸)

۱۷۔ پیشہ اور فن و ہنر کا مقدس ہونا:

پیشہ اور فن و ہنر جہاں ایک خدائی حکم ہے وہاں ایک مقدس اور پاکیزہ عمل اور اللہ کا محبوب و پسندیدہ امر بھی ہے اور جہاد کی مانند ہے۔

سرما یہ جو نبی گردش یا نقصان یا تباہی کی صورت سے خارج ہو کر ضمانت و غرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو عقیم (فائدے سے خالی) اور بے سود ہو جاتا ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے اس کا کوئی جائز فائدہ نہیں رہتا اور جو اضافی مقدار بھی اصل سرمائے پر لی جائے گی وہ سود اور حرام کے زمرے میں آئے گی۔

۱۸۔ واقفیت و آگاہی:

ہر مالی تبادلہ اور سرمائے کی گردش طرفین کی پوری واقفیت و آگاہی ہی سے ہونی چاہئے اور ضروری سمجھا جائے گا۔

نہی النبی عن الغرر (صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۱۵۳)
”اپنے کو معرض ہلاکت میں ڈالنا خدعاً دھوکہ و فریب ہے۔“

۱۹۔ خلاف عقل امور سے مقابلہ:

اسلام عقل کو قابل احترام چیز اور خدا کا باطنی رسول سمجھتا ہے اصول دین عقلی و منطقی دلیل کے بغیر قابل قبول نہیں ہیں۔ فروع دین میں بھی عقل اجتہاد کے سرچشموں میں سے ایک ہے۔ اسلام عقل کو ایک قسم کی طہارت اور عقل کے زائل ہونے کو ایک طرح کا محدث ہونا سمجھتا ہے لہذا جنون یا مستی کا طاری ہونا بھی پیشاب کرنے یا سو جانے کی مانند وضو کو باطل کر دیتا ہے۔ اسلام ہر طرح کی مستی اور نشے کا مخالف ہے اور مطلق تام نشآ اور چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ ہر اس چیز کا مخالف ہے جو عقل کی مخالف ہو اور یہ مخالفت دین کا جزو لا ینک ہے۔ (جو چیز نبی نبوی کی

۱۲۔ عقیم

زبان میں ”اسراف و تبذیر“ سے تعبیر کیا گیا ہے ممنوع اور حرام ہے۔

۲۰۔ زندگی میں ترقی و توسعہ:

اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لئے ضروریات زندگی کی چیزوں میں اضافہ کرنا اگر کسی کی حق تلفی یا اسراف اور فضول خرچی کی حد میں داخل نہ ہو جائے نہ صرف جائز بلکہ قابل تعریف فعل ہے اور اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

۲۱۔ رشوت:

اسلام میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں کی سخت ذمۃ کی گئی ہے اور دونوں کو آتش جہنم کا مستحق قرار دیا گیا ہے اور جو پیسے اس طرح سے حاصل ہوتے ہیں وہ ناجائز اور حرام ہیں۔

۲۲۔ ذخیرہ اندوزی:

اگر عام طور پر اشیائے ضرورت (خاص کر اشیائے خوردنی) کو ذخیرہ کر لیا جائے تاکہ ان کی قیتوں میں اضافہ ہو جائے تو یہ عمل ان اشیاء کا مہنگا پہنچا حرام اور ممنوع ہے حکم شرعی مالک کی خواہش اور مرضی کے خلاف ان جمع شدہ اشیاء کو بازار میں لائے گا اور انہیں عادلانہ نرخ پر فروخت کرنے گا۔

۲۳۔ آمدنی کا مصلحت کی بنیاد پر ہونا نہ کہ طلب و تقاضے کی بنیاد پر:

عام طور پر چیزوں کی قدر و قیمت اور مالیت کا تعین صارفین کی طلب اور

ان اللہ یحب المومن المحترف
(وسائل حج ۱۲ ص ۱۳۳ ان الفاظ کے ساتھ: ان اللہ یحب المحترف
الامین)

”خداوند عالم اس مومن کو دوست رکھتا ہے جو صاحب فن و حرفت ہو۔“
الکامل عیالہ کا الْمُجَاهِدِ فی سَبِّیْلِ اللّٰہِ (وسائل حج ۱۲ ص ۳۳ وہاں
پر عیالہ کی جگہ علی عیالہ آیا ہے)

”جو شخص اپنے عیال کے لئے اپنے کورنچ و تکلیف میں ڈالتا ہے وہ اس شخص
کی مانند ہے جو راہ خدا میں چہار کرتا ہے۔“

۱۸۔ استھصال کی ممانعت:

اسلام استھصال و استثمار یعنی دوسروں کے کام سے بلا عوض یا غیر مناسب
معاوضہ حاصل کرنے کو خواہ وہ کسی شکل اور کسی تدبیر سے ہونا جائز اور ممنوع قرار دیتا
ہے۔ کسی کام کے ناجائز ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ
استھصالی ماہیت رکھتا ہے۔

۱۹۔ اسراف و فضول خرچی:

لوگ اپنے اموال کے مالک ہیں اور ان پر اپنا پورا تسلط رکھتے
ہیں (الناس مسلطون علی اموالہم) لیکن یہ تسلط اس معنی میں ہے کہ اسلام
نے جو حدود معین کی ہیں وہ ان کے دائرے میں ہونہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔
مال کا ضائع کرنا ہر شکل میں اور ہر صورت سے خواہ وہ سچینک دینے کی صورت میں ہو یا
تبہ کن تجملات اور زیب و زینت کی چیزوں پر تصرف کی شکل میں ہو اور جسے اسلام کی

پیشہ کمانا حرام ہے جو دشمن کی بندی مضمبوٹ کرنے کا باعث ہو خواہ وہ فوجی اعتبار سے ہو یا اقتصادی ثقافتی یا جاسوسی کے اعتبار سے اسلامی محاڑ کو کمرہ بناتا ہو چاہئے اسلحہ فروشی کی صورت میں ہو یا ایسی دوسری چیزوں کی فروخت کی شکل میں جن کی احتیاج ہو اور جو عملاً مذکورہ امور کا سبب ہوں اور نایاب قلمی نسخوں کا بیننا بھی انہی چیزوں میں شامل ہے۔

(د) ایسے امور کے ذریعے مال حاصل کرنا جو فرد یا معاشرے کے لئے تباہ کن اور نقصان پہنچانے والے ہوں مثلاً شراب فروشی آلات قمار کا بیننا اسی طرح نجس لعین چیزوں کا بیننا اور ناقص اور ملاوٹ کی ہوئی چیزیں بھی اسی زمرے میں شامل ہیں (ان سب طریقوں سے) مال حاصل کرنا جو اکھیلنا امر حرام کی طرف دوسروں کو مائل کرنا اور لے جانا کسی مومن کی ہبجو ظالموں کی مدد کرنا اور ان کی نوکری اور ملازمت وغیرہ (ممنوع اور حرام ہے) البتہ کسب حرام کی دوسری قسم بھی ہے جو کام کے خلاف مصلحت ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ اس کے لین دین سے بالاتر ہونے کی وجہ سے حرام ہے، بہت سے کام بزرگی و پاکیزگی کی ایسی حد میں ہیں کہ ان کے عوض قرار دینا ان کی حیثیت و عظمت و حرمت کے خلاف ہے جیسے فتویٰ دینے شرعی فیصلہ کرنے اصول و فروع دین کی تعلیم دینے وعظ و نصیحت کرنے اور اس عجیسی دوسری چیزیں اور ممکن ہے طابت بھی اسی میں شامل ہو۔

مذکورہ کام اور پیشے اپنے مقدس ہونے کی بناء پر لین دین اور مبادله سے بالاتر ہیں اور اس چیز سے کہیں بلند ہیں کہ آمدنی اور دولت کی جمع آوری کا ذریعہ بنیں یہ سب کام واجبات کا ایک سلسلہ ہیں جنہیں بلا عوض انجام پانا چاہئے البتہ مسلمانوں کا بیت المال ان مقدس کاموں کے انجام دینے والوں کی ضروریات زندگی کے آخر اجاجات کا ذمہ دار ہوگا۔

ماںگ سے ہوتا ہے اور کسی کام کے جائز ہونے کے لئے اس کام کے عوام کی خواہشات کے مطابق ہونے کو کافی سمجھا جاتا ہے لیکن اسلام کسی چیز کی مالی قدر و قیمت کے تعین اور لوگوں کے کام کو جائز قرار دینے کے لئے لوگوں کی طلب اور ماںگ کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ کام کے معاشرے کی مصلحت کے مطابق ہونے کو عرف شریعت میں مالیت کے تعین اور کام کے جائز ہونے کے لئے لازمی شرط قرار دیتا ہے یعنی اسلام صرف لوگوں کی خواہشوں اور رغبوتوں کو جائز آمدنی کا منع نہیں سمجھتا بلکہ خواہشات اور رغبوتوں کے علاوہ معاشرے کی مصلحت کے ساتھ آمدنی کو بھی شرط قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام لوگوں کی طلب کو رسد کے جواز کے لئے کافی نہیں جانتا اس لئے اسلام میں بعض کاموں اور کسب کے طریقوں کو "مکاسب محمرہ" کہا گیا ہے۔ مکاسب محمرہ (کمانے کے حرام طریقے) چند قسم کے ہیں:

(الف) چیزوں کا ایسا لین دین جو جہالت میں ڈالنے کا موجب ہو۔ ایسی چیزوں جو لوگوں کو عملی جہالت اور فکری و اعتمادی روگردانی کی طرف راغب کرنے اور شوق دلانے کا سبب ہوتی ہیں حرام ہیں اگرچہ ان کی ماںگ کافی مقدار میں ہو اس لحاظ سے بت فروشی صلیب کا بیننا تدیس مافظہ (عورت کی آرائش کرنا اور اس آرائش کے ذریعے عورت کے عیوب کو چھپانا تاکہ اس کا رشتہ لینے کے لئے آنے والے فریب کھا جائیں) کسی ایسے شخص کی مدح کرنا جو اس مدح کا مستحق نہ ہو کہا نت اور غیب گوئی یہ سب امور حرام ہیں اور ان طریقوں سے مال وصول کرنا بھی ممنوع اور حرام ہے۔

(ب) ان چیزوں کا باہمی تبادلہ جو گمراہ کرنے اور غفلت میں مبتلا کرنے کا باعث ہیں۔ گمراہ کن کتابوں اور فلموں کی خرید و فروخت اور ہروہ کام جو کسی طرح سے بھی معاشرے کی گمراہی کا موجب ہونا جائز اور حرام ہے۔

(ج) وہ کام جو دشمن کی تقویت کا موجب ہو کسی بھی ایسے طریقے سے روپیہ

وہ فریضہ ہے جو امام با قرآنیہ السلام کے مبارک الفاظ میں تمام اسلامی فرائض کا پایہ اور ستون ہے۔ یہ اصول مسلمان کو داعیٰ اور فکری انقلاب کے ذریعے اصلاح معاشرے کے لئے مسلسل کوشش اور تمام برائیوں اور تباہ کاریوں سے جنگ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجْتُ لِلَّذِيْنَ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

”تم بہترین گروہ ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے منع کرتے ہو۔“ (سورہ آل عمران آیت ۱۱۰)

جناب رسالت آب فرماتے ہیں:

لَتَا مِرْوَنَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ او يَسْلَطُنَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ شَرَارُ كَمْ فِي دُعَوَيْ أَخْيَارٍ كَمْ فَلَا يَسْتَجَابُ لَهُمْ (کافی ج ۵ ص ۵۶ کچھ کمی بیشی کے ساتھ)

”تم لوگوں کو امر بالمعروف کرنا چاہئے برائیوں سے روکنا چاہئے ورنہ خداوند عالم تمہارے بروں کو تم پر مسلط کر دے گا پھر تمہارے نیک لوگ دعا کریں گے تو مตอบ نہیں ہو گی۔“

۲۶۔ توحید:

اسلام ہر چیز سے زیادہ دین توحید ہے توحید کے بارے میں کسی خدشے کو چاہئے وہ توحید نظری میں ہو یا توحید عملی میں قبول نہیں کرتا اسلامی افکار فقرا اور کردار سب خدا سے شروع ہوتے ہیں اور خدا ہی پر ختم ہوتے ہیں اس لحاظ سے اسلام ہر قسم کی

۲۳۔ حقوق کا دفاع
حقوق کا دفاع کرنا (خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) اور زیادی وزبردستی کرنے والے کے خلاف جہاد کرنا واجب اور مقدس کام ہے۔

لَا يُحِبُّ اللَّهُ أَجْهَرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقُوَّلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ
”خداؤند عالم اعلانیہ طور پر بدگوئی کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو۔“ (سورہ نساء آیت ۱۳۸)

رسول اکرم کا ارشاد گرامی ہے:

افضل الجہاد کلمة عدل عند امام جائر (کافی ج ۵ ص ۲۰)
”بہترین جہاد ظالم و جابر پیشوائے سامنے عدل و انصاف کی بات کہنا ہے۔“
حضرت علیؑ حضرت رسول خدا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ سے نقل فرماتے ہیں:

لن تقدس امة حتى يوخذ للضعف حقه من القوى غير ممتدع (نهج البلاغه عهد نامہ مالک اشتر)
”کوئی قوم و ملت بزرگی و پاکیزگی (تعزیف و تمجید کی قابلیت) حاصل نہیں کرتی یہاں تک کہ اس مرحلے پر پہنچ جائے کہ کمزور اپنا حق بلا خوف اور بلا جھگ طاقتور سے لے لے۔“

۲۵۔ اصلاح

اصلاح کی کوشش اور فساد و خرابی کے مقابلے میں مسلسل جدوجہد اسلام میں اچھائیوں کا حکم دینا اور اس طرف متوجہ رکھنا اور برائیوں سے روکنا

جاتا ہے اور ان سب کی ایک خاص سمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک حقیقی مسلمان کے کام کی ابتداء انتہا اور وسط اللہ کی ذات ہوتی ہے اور وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک فرائیں دیتا۔

۷۲۔ واسطوں کی نفی:

اسلام اگرچہ زدول فیض میں واسطوں اور ذریعوں کو قبول کرتا ہے اور علت و معلول کے نظام کو خواہ وہ امور مادی ہوں اور خواہ امور معنوی میں حقیقی اور واقعی شمار کرتا ہے مگر پرستش اور عبادت کی منزل میں تمام وسائل اور ذرائع کو مسترد کر دیتا ہے جیسا کہ ہم سب اس چیز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تحریف شدہ مذاہب میں فرد (یعنی انسان افرادی حیثیت سے) خدا سے براہ راست رابطہ اور تعلق کی قدر و قیمت اپنے ہاتھ سے کھو چکا ہے خدا اور بندے کے درمیان جدائی فرض کر لی گئی ہے صرف کا ہن یا روحانی پیشوایا۔ اہ راست خدا کے ساتھ راز و نیاز کر سکتا ہے اور پس اسی کو حق ہے کہ دوسرے تمام لوگوں کے پیغامات کو خدا تک پہنچائے۔ اسلام میں یہ کام ایک طرح کا شرک گنا جاتا ہے قرآن کریم صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

”(اے جبیب) اگر میرے بندے میرے بارے میں تم سے سوال کریں تو کہہ دو! میں نزدیک ہوں میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔“

۷۳۔ اہل توحید کے ساتھ باہمی زندگی کا امکان:

اسلام کی نظر میں تمام مسلمان اپنے ملک میں دوسرے ادیان کے مانے والوں اور پیروکاروں کے ساتھ جو اصول توحید کو قبول کرتے ہیں جیسے یہودی عیسائی اور جوئی اگرچہ فی الحال وہ توحید سے مخالف ہی ہوں پھر بھی چند مخصوص شرائط کے ساتھ

شویت تخلیق یا کسی بھی قسم کی زیادتی کو جو اس اصول کو مخدوش کرتی ہو سختی کے ساتھ مسترد کرتا ہے جیسے (معاذ اللہ) خدا اور شیطان کی شویت یا خدا اور انسان کی دویت یا خدا اور مخلوق خدا کی دویت۔

ہر کام کو اللہ کے نام سے خدائی فکر کے ساتھ اور اللہ سے تقرب و نزدیکی حاصل کرنے کے لئے شروع ہونا چاہئے اور ان جام کو پہنچانا چاہئے اور جو کام اس کے علاوہ ہو گا وہ اسلامی کام نہیں ہے اسلام میں تمام را ہیں تو حید پر ختم ہوتی ہیں۔ اخلاق اسلامی کا سرچشمہ توحید ہے اور یہ تو حید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اسلامی تربیت بھی اسی طرح ہے سیاست اسلامی اقتصاد اسلامی اور اجتماع اسلامی سب اسی طرح اسلام سے والستہ ہیں۔ اسلام میں ہر کام خدا کے نام سے اور اسی کی استعانت سے شروع ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
”اور خدا کے نام اور اس کی حمد پر ختم ہوتا ہے۔“

أَكْحَمُدُ اللَّهُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ①

”اور خدا کے نام سے اور اسی پر اعتماد سے ہر کام جاری ہوتا ہے۔“

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلَيْتَوْكِلُ الْمُؤْمِنُونَ ⑩

(سورہ ہود آیت ۱۵۶ اور سورہ آل عمران آیت ۱۲۲)

ایک حقیقی مسلمان کی توحید ایک خیال اور خشک عقیدہ نہیں ہے جس طرح ذات خدا پنی مخلوقات سے جدا نہیں ہے بلکہ سب کے ساتھ ہے اور سب پر محیط ہے۔ ساری چیزیں اسی سے شروع ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہوتی ہیں۔

اسی طرح توحید کا تصور بھی ایک حقیقی موحد کے پورے وجود پر محیط ہوتا ہے اس کے تمام افکار و خیالات اس کی تمام قوتیوں اور اس کے طور طریقوں پر سایہ فلن ہو

مربوط ہیں مشترک اور مساوی ہیں مثلاً تحصیل علم کا حق عبادت و پرستش کا حق شریک حیات کے انتخاب کا حق ملکیت کا حق اپنی مملوکہ چیزوں میں تصرف کا حق وغیرہ اور جہاں تک یہ فرعی مختصات اور جنسیت سے مربوط ہیں تو وہاں بھی برابر اور مساوی حالت تو ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے سے مشابہت اور یکسانیت کی صورت نہیں ہوتی اور دو جنسیت ہوتی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں مولف کی کتاب ”اسلام میں خواتین کے حقوق“)

ان کے ہمراہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن اسلامی ملک کے اندر مشترک کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے مسلمان اسلام کی اعلیٰ مصلحتوں کی بنیاد پر مشترکین کے ساتھ صلح و صفائی اور امن کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے معاهدہ کر سکتے ہیں یا کسی خاص مناسنے پر بھی معاهدہ کر سکتے ہیں۔

۲۹۔ مساوات:

اسلامی آئینہ یا لوچی کے اصول و اركان مساوات اور غیر امتیازی سلوک ہے۔ اسلام کی نظر میں سب انسان اپنی ذات کے لحاظ سے برابر ہیں اور لوگ اس اعتبار سے دو یا کئی قسموں میں پیدا نہیں کرنے گئے ہیں رنگ خون نسل و قومیت بلندی و برتری کے معیار نہیں ہیں۔ سید قریشی اور سیاہ جبشی دونوں برابر ہیں۔ اسلام میں آزادی جمہوریت اور عدل و انصاف انسانوں کی برابری اور مساوات کا نتیجہ اور شرہ ہے۔

اسلامی نظریے کے مطابق صرف چند محدود و معین حالات میں افراد کے بعض حقوق خودا نہیں افراد اور معاشرے کی چند مصلحتوں کے پیش نظر و قی طور پر سلب ہوتے ہیں لیکن یہ چیز افراد کے جو ہر ذات خون نسل اور مقام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی غلاموں کی غلامی کا وقت اور عارضی دور جو اسلام کی نظر میں شفاقتی تعلیمی اور تربیتی پہلو رکھتا تھا نہ کہ اقتصادی اور حصول فرع کا پہلو اور وہ دور اسلامی تربیت کے لئے ایک پروگرام کی حیثیت رکھتا تھا۔

۳۰۔ اسلام میں حقوق شرعی ذمہ داریاں اور سزا نہیں دو جنسوں کے لحاظ سے ہیں یعنی جس طرح انسانیت میں مردوزن مشترک ہیں اور نوعی مشترکات رکھتے ہیں لیکن ان کی جنسیت (یا صنفیت) ان کو خاص فرعی امتیاز عطا کر دیتی ہے اسی طرح حقوق شرعی ذمہ داریاں اور سزا نہیں بھی جہاں تک دو جنسوں کی مشترکات کے ساتھ

تلاوت ہوتی تھی اور دوسروں کو فیض پہنچاتا تھا و سری چیز رسول اکرم کی عظیم اور ہر دل عزیز شخصیت تھی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی اور نگاہوں کو شوق دیدار عطا کرتی تھی۔ یہاں پر ہم حضور اکرم کی مقدس و باعظام شخصیت کا شخص اجازہ لیتے ہیں:

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا دور

ابھی رسول اکرم رحم مادر میں ہی تھے کہ آپ کے پدر بزرگوار کا شام کے ایک تجارتی سفر کے دوران مدینہ کے قریب انتقال ہو گیا۔ آپ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کی تربیت و کفالت کی ذمہ داری لی۔ بچپن ہی سے بزرگ اور عام لوگوں سے بلند و بالاتر ہونے کے آثار آپ کے چہرہ مبارک اور رفتار و گفتار سے ظاہر ہوتے تھے۔ جناب عبدالمطلب نے اپنی فراست سے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ آپ کا یہ پوتا ایک روشن و تابندہ مستقبل کا حامل ہے۔

آپ ابھی آٹھ سال کے تھے کہ آپ کے دادا کا بھی انتقال ہو گیا اور ان کی وصیت کے مطابق آپ کے محترم چچا جناب ابوطالب نے آپ کی کفالت کی ذمہ داری قبول کی۔ جناب ابوطالب بھی اس بچے کے عجیب چال چلن جو عام بچوں سے بالکل مشاہدہ نہیں رکھتا سے توجہ و حیرت میں رہتے تھے۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ نے اپنے ہم سن اور ہم عمر بچوں کی طرح غذا کے سلسلے میں حص سے کام لیا ہو۔ آپ اتحوڑے سے کھانے پر اتفاق فرماتے اور زیادہ روئی سے پرہیز کرتے (رسول اکرم اکی سیرت خلق اور خصلت کا جو خلاصہ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں وہ خاص کر علامہ بزرگ معاصر آقاۓ حاج سید ابوالفضل مجتهد زنجانی کے مقالہ ”محمد خاتم صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبران“ جلد اول سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مولف) اپنے ہم عمر بچوں کے برخلاف اور اس زمانے کی عادت و تربیت کے برخلاف آپ اپنے بالوں کو درست اور اپنے سر اور چہرہ مبارک کو صاف و شفاف رکھتے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ابن عبد اللہ بن پرنبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ۷۵ء میں آپ کی ولادت با سعادت ہوئی۔ چالیس سال کی عمر مبارک میں آپ نے اعلان رسالت فرمایا۔ آپ نے تیرہ سال تک مکہ میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور طرح طرح کی زمینیں تکلیفیں اور مصیتیں برداشت کیں اور اس عرصے میں ایک خالص اسلامی گروہ کی تربیت فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسی کو اسلام کی تبلیغ کا مرکز قرار دیا۔ دس سال تک مدینہ میں آزادانہ دعوت تبلیغ دین فرمائی اور عرب سرکشوں سے مقابلہ کیا اور سب کو مغلوب کر دیا۔ ان دس برسوں میں تمام جزیرہ العرب مسلمان ہو چکا تھا۔

قرآن مجید کی آیات کریمہ تقریباً ۲۳ سال کے عرصے میں آنحضرت پر نازل ہوئیں۔ تمام مسلمان قرآن مجید اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت کے بارے میں تجہیز اور حیرت انگیز عشق و محبت والفت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ رسول اکرم نے گیارہویں صدی ہجری میں یعنی مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانے کے گیارہویں سال میں جب کہ آپ کی تبلیغ رسالت کا تنسیسوال اور آپ کی عمر مبارک کا تریسیھواں (۲۳) سال تھا دنیا سے رحلت فرمائی۔ اس حالت میں کہ ایک نوبنیاد اور روحانی نشاط سے سرشار معاشرے اور ایک تعمیری نظریہ کائنات پر ایمان رکھنے والے معاشرے کی جو دنیا بھر میں اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتا تھا مستحکم و مضبوط بنیاد قائم کر دی تھی اور اسے قائم و دائم چھوڑ گئے تھے۔ جس چیز نے اس نوبنیاد معاشرے کو روحانیت اتحاد اور نشاط عطا کیا تھا وہ دو چیزیں تھیں ایک قرآن کریم جس کی ہمیشہ

ایمان داری کھل کر ظاہر ہوئی۔ آپ نے اپنی دیانت و ایمان داری میں اس قدر زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ لوگوں نے آپ کا لقب ہی ”محمد امین“ قرار دے دیا تھا اور اپنی امانتیں حضرت کے سپرد کیا کرتے تھے یہاں تک کہ بعثت کے بعد بھی قریش کے لوگ آپ سے عداوت و دشمنی رکھنے کے باوجود اپنی امانتیں آپ کے سپرد کر دیا کرتے تھے اسی وجہ سے مدینہ سے ہجرت کرتے وقت حضرت علیؑ کو اپنے بعد چند روز کے لئے مکہ میں چھوڑا تھا تاکہ ساری امانتوں کو ان کے اصل مالکوں کے حوالے کر دیں۔

ظلم سے مقابلہ

زمانہ جاہلیت میں ایک ایسے گروہ کے ساتھ جو خود بھی طاقوٰ ظالموں کے ظلم و ستم کا شکار تھا مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت اور ظالموں سے مقابلہ کا معاهدہ فرمایا تھا۔ یہ معاهدہ مکہ کی ایک اہم شخصیت عبداللہ بن جرعان کے گھر منعقد ہوا تھا اور ”حلف فضول“ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ اپنے دور رسلالت میں بھی اس معاهدے کو یاد فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں اس معاهدے کے ٹوٹنے پر راضی نہیں ہوں اور میں اب بھی ایسے معاهدوں میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوں۔

گھر بیلو اخلاق

آپ گھر میں بہت مہربان تھے۔ اپنی ازدواج کے ساتھ کسی سختی نہیں کرتے تھے اور یہ بات مکہ والوں کے اخلاق و عادات کے خلاف تھی۔ اپنی بعض ازدواج کی بذریعاتی کو برداشت کرتے تھے یہاں تک کہ دوسرے آپ کے اس تخلی و برداشت سے رنجیدہ ہوتے تھے۔ آپ لوگوں کو عورتوں کے ساتھ اچھی معاشرت کی تاکید فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمام لوگ اچھی و بربی عادات کے حامل ہوتے ہیں لہذا مردوں نہیں چاہئے کہ اپنی بیوی کے

تھے۔ جناب ابوطالب سے ایک روز حضرت نے خواہش کی کہ آپ ان کے سامنے اپنا لباس اتار کر بستر پر (آرام کرنے کے لئے) جائیں تو آپ اکو یہ خواہش ناگوار گزرا لیکن چونکہ آپ اپنے چچا کے حکم سے سرتبا نہیں کرنا چاہتے تھے لہذا اپنے چچا سے کہا کہ آپ اپنا منہ پھیر لیں تاکہ میں اپنا لباس اتار سکوں۔ ابوطالب بچے کی اس بات سے بہت حیرت زدہ ہوئے کیوں کہ عرب میں اس وقت بچے تو بڑی عمر والے مرد بھی اپنے جسم کو (لوگوں کے سامنے) برہنہ کرنے سے پر ہیز نہیں کرتے تھے۔ جناب ابوطالب کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنائے ہو دہ کام کرتے اور بے جا نہیں ہوئے کبھی نہیں دیکھا بچوں کے کھل کوڈ کی طرف کبھی رغبت نہیں فرماتے تھے۔ خلوت نہیں اور تہائی کو پسند فرماتے تھے اور ہر حالت میں منسر المزاج اور متواضع رہتے تھے۔

کاہلی اور بے کاری سے نفرت

آنحضرت اکاہلی اور بے کاری سے سخت نفرت کرتے تھے اور فرماتے تھے: ”خدایا سستی کاہلی بے کاری عاجزی اور بدحالی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔“ (المجمع الصغیر ج ۱ ص ۵۸)

مسلمانوں کو کام کرنے کا شوق دلاتے تھے اور فرماتے تھے:

”عبدات کے ستر (۷۰) حصے ہیں اور اس کا بہترین حصہ حلال روزی کمانا ہے۔“ (کافی ج ۵ ص ۷۸)

امانت

بعثت سے پہلے جناب خدیجہ کی طرف سے جو بعد میں آپ کی زوجیت میں آئیں شام کے ایک تجارتی سفر پر گئے۔ اس سفر میں آپ کی لیاقت و صلاحیت اور

تھے کہ یہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ جو غذا تم کھاتے ہو وہی غذا انہیں بھی کھلا دا اور جو کپڑا تم پہنتے ہو وہی کپڑا انہیں بھی پہنا دا طاقت فرسا اور مشکل کام کا بوجھ ان پر مت ڈالو۔ خود تم بھی کاموں میں ان کی مدد کیا کرو۔ حضرت فرماتے تھے ان کو غلام اور کنیز کہہ کرنہ پکارا کرو کیوں کہ ہم سب خدا کے مملوک اور بندے ہیں اور مالک حقیقی خدا ہے بلکہ انہیں لفظ حقیقی (جو ان مرد) یا فتاہ (جو ان عورت) کے لفظ سے پکارا کرو۔ اسلامی شریعت میں غلاموں اور کنیزوں کی آزادی کے لئے وہ تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کی گئی ہیں جن کے نتیجے میں انہیں مکمل آزادی نصیب ہو آپ بردا فروشی کو تمام پیشوں سے براترین پیشہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ”خدا کے نزدیک بدترین انسان آدمیوں کو یقین دالے ہیں۔“ (وسائل ج ۱۲ ص ۹۷)

صفائی پا کیزگی اور خوشبو

صفائی اور خوشبو سے آنحضرت کو بہت شعف تھا خود حضرت ہمیشہ اس کا لحاظ فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم دیتے تھے اور تاکید فرماتے تھے کہ وہ اپنے جسموں اور گھروں لوپاک و صاف اور خوشبودار رکھیں خصوصاً جمعہ کے دنوں میں انہیں غسل کرنے اور اپنے کو معطر و خوشبودار رکھنے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ ان سے بدبو محسوس نہ ہو اور اس کے بعد لوگ نماز جمعہ کے لئے مسجد میں حاضر ہوں۔

ملاقات اور معاشرت

رسول اکرم لوگوں کے ساتھ معاشرت رکھنے اور ملنے جلنے میں بہت مہربان تھے۔ سلام کرنے میں سب پر یہاں تک کہ بچوں پر بھی سبقت فرماتے تھے۔ کسی کے سامنے اپنے پاؤں نہیں پھیلاتے تھے اور کسی کی موجودگی میں ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے

صرف ناپسندیدہ پہلوؤں پر ہی نظر رکھے اور اپنی بیوی کو چھوڑ دے کیوں کہ اگر اس کی ایک خصلت سے اسے رنج پہنچتا ہے تو اس کی دوسری خصلت مرد کی خشنودی کا باعث بھی ہوتی ہے اور ان دونوں خصلتوں کو ساتھ ساتھ نظر میں رکھنا چاہئے۔ آپ اپنے فرزندوں اور نواسوں پر حد سے زیادہ شفیق اور مہربان تھے ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اپنی آنکھوں میں انہیں بٹھاتے تھے انہیں اپنے کاندھوں پر سوار کرتے تھے ان کا بوسہ لیتے تھے۔ یہ سب باقی اس زمانے کی راجح عادات و خصوصیات کے برخلاف تھیں ایک روز مذہبیہ کے شرفاء میں سے ایک شخص کی موجودگی میں آپ اپنے ایک نواسے (حضرت امام حسنؑ) کا بوسہ لے رہے تھے اس شخص نے کہا میرے دو بیٹے ہیں میں نے آج تک ان میں سے کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

من لا يرحم ولا يرحم (الفقيه ج ۲ ص ۲۰۶)

”جو شخص مہربانی نہیں کرتا خدا کی رحمت و مہربانی اس کے شامل حال نہیں ہوتی۔“ مسلمانوں کے بچوں کے ساتھ بھی آپ مہربانی فرماتے تھے۔ ان کو اپنے زانو مبارک پر بٹھا کر ان کے سروں پر دست شفقت پھیرتے تھے کبھی کبھی ماں ہمیں اپنے چھوٹے بچوں کو حضرت کو دیتی تھیں کہ آنحضرت ان کے واسطے دعا فرمائیں۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہو جاتا تھا کہ وہ بچے آپ کے لباس پر پیشاب کر دیتے تھے اور اس وجہ سے ماں ہمیں پریشان اور شرمندہ ہو جایا کرتی تھیں کہ بچے کے پیشاب جاری رہنے کو روک دیں تو آنحضرت انہیں اس کام سے سختی کے ساتھ منع فرماتے کہ بچے کے پیشاب کو مت روکو اور جہاں تک میرے کپڑوں کے بخش ہونے کا تعلق ہے تو میں انہیں پاک کر لوں گا۔

غلاموں کے ساتھ آپ کا سلوک

آنحضرت غلاموں پر حد سے زیادہ مہربان تھے۔ آپ لوگوں سے فرماتے

تمام بدلسوکیوں کو جوانہوں نے پورے بیس سال کے عرصے میں حضرت کے خلاف روا رکھی تھیں ان سب سے آپ نے چشم پوشی فرمائی اور سب کو ایک ساتھ معاف کر دیا۔ اپنے بیمارے پر چچا حضرت حمزہ کے قاتل کی توبہ قبول کر لیکن اسی فتح کمکے موقع پر چوری کے جرم میں ایک عورت کپڑی لگئی اور اس کا جرم بھی ثابت ہو گیا اس عورت کا خاندان قریش کے شرفاء میں سے تھا اور وہ لوگ حد جاری ہونے کو اپنے لئے تو ہیں سمجھے تھے چنانچہ ان لوگوں نے رسول خدا ﷺ کی خدمت میں بہت دوڑ دھوپ کی اور بہت کوششیں کیں کہ اس عورت پر حد نہ جاری کی جائے اور حضرت اس سے صرف نظر اور درگذر فرمائیں۔ بعض بزرگ صحابہ کو بھی سفارش کے لئے لائے اور ان لوگوں نے سفارش بھی کی لیکن رسول خدا ﷺ کا رنگ غصے کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا:

”کیا یہ سفارش کا موقع ہے؟ کیا چند افراد کی خاطر خدائی قانون کو معطل کیا جا سکتا ہے؟“

اسی روز آپ نے عصر کے وقت اصحاب کے جمع میں خطبه ارشاد فرمایا جس میں کہا:

”پہلی قویں اور ملتیں اس وجہ سے تباہ ہو گئیں کہ انہوں نے خدا کے قوانین نافذ کرنے میں امتیازی سلوک سے کام لیا تھا۔ جب کبھی طاقت وردوں اور مال داروں میں سے کوئی شخص جرم کا مرتكب ہوتا تو اسے معاف کر دیتے تھے اور اگر کوئی ضعیف الحال اور کمزور طبقے کا شخص مرتكب جرم ہوتا تو اسے سزا دیتے تھے۔ اس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے عدل و انصاف کے نافذ کرنے میں کسی کے بارے میں سستی و کابلی اور کوتاہی نہیں کروں گا خواہ شخص خود میرے نزدیک ترین رشتہ داروں میں سے کیوں نہ ہو۔“ (صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۱۳)

تھے۔ زیادہ تر دوزانو بیٹھتے تھے۔ مجلسوں میں دائروں کی شکل میں نشست رکھتے تھے تاکہ مجلس میں بلند و پست جگہ کا وجود ہی نہ ہو اور تمام جگہوں کا درجہ برابر ہو اپنے احباب کے بارے میں دریافت فرماتے رہتے۔ اگر اپنے اصحاب میں سے کسی شخص کو تین روز تک نہ دیکھتے تو اس کے متعلق خاص طور سے معلومات حاصل فرماتے۔ اگر وہ مریض ہوتا تو اس کی عبادت کے لئے تشریف لے جاتے اور اگر وہ کسی پریشانی میں بیٹلا ہوتا تو آپ اس کی مدد فرماتے مجلس و مخالف میں صرف ایک شخص کی طرف نہیں دیکھتے تھے اور خاص طور سے کسی ایک شخص کو خطاب نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنی مقدس نگاہوں کو پورے جمع پر رکھتے تھے اور اس امر سے آپ ا کو سخت نفرت تھی کہ خود آپ بیٹھے رہیں اور دوسرے خدمت کریں (جب کبھی ایسا موقع آتا تو) آپ اپنی جگہ سے فوراً اٹھتے اور دوسروں کے ساتھ کاموں میں شریک ہو جاتے۔ آپ فرماتے تھے کہ ”خداؤند عالم کو یہ بات ناپسند ہے کہ وہ بندہ کو اس حالت میں پائے کہ وہ دوسروں کی نسبت اپنے لئے کسی امتیاز کا قائل ہو جائے۔“ (کحل البصر ص ۲۸)

مزاج میں نرمی بھی سختی بھی

آپ اپنے انفرادی اور شخصی مسائل میں اور ان امور میں جو خاص آپ ا کی ذات اقدس سے مربوط و متعلق ہوتے تھے بے حد نرم مزاج ملائم اور درگذر کرنے والے تھے اور آپ کی اپنے مشن میں اتنی جلد کامیابی اور ترقی کے اسباب میں سے ایک یہی عظیم اور تاریخی (رحم دلی و نرم مزاجی کا) برتواء ہے۔

لیکن اصولی اور اجتماعی امور میں جہاں قانون کی حد شروع ہو جاتی وہاں آپ سختی سے پیش آتے اور پھر اس موقع پر درگذر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ فتح کمک اور قریش پر کامیابی حاصل ہو جانے کے بعد آپ نے قریش کی تمام عداؤتوں اور ان کی

گھنٹوں مشغول رہتے تھے لیکن جماعت میں اختصار کی کوشش فرماتے مامویں میں سے کمزور شخص کا لاحاظہ ضروری سمجھتے تھے اور اس کی وصیت فرماتے تھے۔

زہد اور سادہ زندگی

زہد اور سادہ زندگی آپ کا اصول تھا سادہ غذا نوش فرماتے سادہ لباس زیب تن فرماتے سادہ روشن رکھتے آپ کافرش اکثر چٹائی ہوتی زمین پر بیٹھ جاتے آپ بذات خود بکری کا دودھ دوہ لیا کرتے زین و پالان کے بغیر بھی سواری پر سوار ہوتے تھے اور اس امر سے سختی کے ساتھ منع فرماتے کہ کوئی آپ کی سواری کے ساتھ پیادہ چلے۔ آپ کی غذا اکثر جو کی روٹی اور خرما ہوا کرتی۔ آپ اپنے لباس اور نعلین پر خود ہی اپنے ہاتھ سے پیوند لگا لیتے تھے اس سادگی کے باوجود فلسفہ فقر (متاجگی) کے طرف دار نہیں تھے مال و دولت کو معاشرے کی ترقی اور جائز کاموں میں خرچ کرنے کو لازم سمجھتے تھے آپ فرماتے تھے:

نعم المال الصالح للرجل الصالح (ججته البيضا ج ۶ ص ۳۴)
”کتنی اچھی ہے وہ دولت جو جائز طریقوں سے حاصل ہواں آدمی کے لئے جو اس دولت کو رکھنے کے لائق ہو اور یہ جانتا ہو کہ اسے کیسے خرچ کرے۔“
نیز حضرت فرماتے تھے:

نعم العون على تقوى الله الغنى (وسائل ج ۱۲ ص ۱۶)
”مال و دولت تقوی کے لئے اچھی مدد ہے۔“

ارادہ اور پامردی

آپ اکارادہ عزم مصمم اور آپ اکی استقامت و پامردی بنے نظری تھی اور یہ

عبدات

رات کے کچھ حصہ میں کبھی نصف شب کبھی ایک تھائی اور کبھی دو تھائی رات آپ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اگرچہ آپ کا پورا دن خصوصاً مددینہ میں قیام کے زمانے میں تبلیغی جدوجہد اور دوسرا دینی کاموں میں گزر جاتا تھا پھر بھی آپ کے عبادت کے وقت میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی آپ اپنا کامل آرام و سکون عبادت الہی اور اپنے پروردگار کے ساتھ راز و نیاز میں پاتے تھے۔ آپ کی عبادت بہشت کے طمع یا جہنم کے خوف کی بناء پر نہیں ہوتی تھی بلکہ آپ کی عبادت عاشقانہ اور شکر گزاروں جیسی ہوتی تھی۔ ایک روز آپ کی ازدواج میں سے کسی ایک نے کہا کہ آپ اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں۔ آپ تو بخشے ہوئے ہیں آپ نے جواب دیا کہ ”کیا میں ایک شکر گزار بندہ نہیں ہوں؟“، آپ روزے بھی بہت رکھتے تھے ماہ شعبان اور رمضان کے علاوہ ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے اور ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں بالکل آرام چھوڑ دیتے اور مسجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھ جاتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے لیکن دوسروں سے فرماتے تھے کہ تمہارے لئے یہی کافی ہے کتم ہر بیانے میں تین دن روزے رکھ لیا کرو فرماتے تھے: اپنی قوت و طاقت کے مطابق عبادت کیا کرو۔ اپنی استعداد سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر مت لا دو ورنہ اس کا نتیجہ بر عکس ہو گا آپ رہبانیت گوشہ نشینی اور خلوت میں بیٹھ جانے اور اہل و عیال کو ترک کر دینے کے خلاف تھے۔ اصحاب میں بعض نے اسی کام کا مضموم ارادہ کر لیا تھا تو وہ ملامت و سرزنش کے مستحق قرار پائے۔ آپ فرماتے تھے تمہارا بدن تمہارا اہل و عیال تمہارے دوست و احباب سب کے حقوق تمہارے اوپر واجب ہیں تمہیں ان حقوق کا لاحاظہ رکھنا چاہئے۔

تھائی کی حالت میں عبادت کو طول دیتے تھے کبھی کبھی تجدی کی حالت میں

عطافرمانا یہ سب چیزیں اپنے اصحاب کے درمیان آپ اکی عظیم و بے نظیر تاثیر کے اسباب میں سے تھیں۔ قرآن کریم ایک مقام پر اس مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے:

فِيهَا رَحْمَةٌ مِّنَ اللَّهِ لِمَنْ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيلَ الْقُلُوبِ
لَا نَفْضُوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ
وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَّمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

(سورہ آل عمران آیت ۱۵۹)

”اے جیبی! اس شفقت کی وجہ سے جو خدا نے آپ کے دل میں پیدا کی ہے آپ اپنے اصحاب کے ساتھ نبی کا برداور رکھتے ہیں اگر آپ سخت مزاج اور تنفس ہوتے تو یہ لوگ آپ سے دور ہی رہتے اور منتشر ہو جاتے پس آپ ان کے ساتھ عفو و درگذر ہی سے کام لیں اور ان کے لئے طلب مغفرت کرتے رہیں اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کریں اور جب کسی کام کا پختہ عزم وارادہ کر لیں تو پھر بس خدا پر بھروسہ کریں۔“

نظم و ضبط

نظم و ضبط اور باقاعدگی آپ کے تمام کاموں پر حاوی اور حاکم تھی آپ اپنے اوقات کو کاموں کے لحاظ سے تقیم فرمادیا کرتے تھے ہر کام کے لئے ایک معین وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام اور اسی عمل کی لوگوں کو وصیت بھی فرمایا کرتے۔ آپ کے اصحاب بھی آپ سے متاثر ہو کر نظم و ضبط کا خاص خیال رکھتے تھے بہت سے منصوبوں کو جنہیں ضروری و اہم سمجھتے تھے کہ وہ ظاہرنہ ہوں تو انہیں ہرگز ظاہرنہیں فرماتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن اس سے آگاہ ہو جائے۔ آپ کے اصحاب آپ

چیز آپ کے اصحاب میں بھی سراحت کر گئی تھی آپ ا کا ۲۳ سالہ دور بعثت و رسالت مکمل عزم و استقامت کا درس ہے آپ اپنی مقدس حیات کی تاریخ میں بارہا یہ سخت حالات سے دوچار ہوئے کہ تمام امیدیں ہر طرف سے منقطع ہو چکی تھیں لیکن آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی ہمت ہارنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں آنے دیا۔ آپ ا کا ایمان کامل و حکم ایک لمحہ کے لئے بھی نصرت و توفیق الہی کی نا امیدی سے متزلزل نہیں ہوا۔

قیادت

اگرچہ آپ ا کا حکم اصحاب کے درمیان فوری طور پر نافذ العمل ہوتا تھا اور وہ لوگ بار بار کہتے تھے کہ جب ہم آپ پر پختہ اور یقینی ایمان رکھتے ہیں تو اگر آپ ا ہمیں حکم دیں کہ ہم سمندر میں ڈوب جائیں یا اپنے آپ ا کو آگ میں جلا دیں تو ہم ایسا ہی کریں گے پھر بھی آپ کا طریقہ کارا اور آپ کی روشن حاکمانہ نہیں تھی۔ جن کاموں میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں پہنچا تھا ان کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے اور ان کے خیالات و افکار کا لحاظ فرماتے تھے اور اس طریقے سے ان کی شخصیتوں کو ابھارتے تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر جنگ کے لئے اقدام کا مسئلہ اسی طرح لشکر گاہ کے تعین کا مسئلہ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک و برداشت کا مسئلہ۔ ان سب مسائل کو آپ نے باہمی مشاورت پر چھوڑ دیا۔ احمد میں بھی اس مسئلے کے متعلق کہ لشکر گاہ شہر مدینہ ہی کو بنایا جائے یا اس کے لئے شہر سے باہر کوئی جگہ منتخب کی جائے یہ مسئلہ بھی مشاورت سے ہی طے ہوا جنگ احزاب اور جنگ توبک میں بھی اصحاب سے مشورہ کیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نزی و مہربانی عفو و درگذر اپنے اصحاب کے واسطے طلب و مغفرت اور امت کے گناہوں کی بخشش کے لئے آپ ا کی بے چینی و بے تابی اسی طرح اپنے اصحاب کو سمجھنا اور انہیں وقعت و اہمیت دینا ان کو شیر قرار دینا اور شخصیت

یہاں تک کہ جب آپ کے مخلص صحابی سعد بن معاذؑ کا انتقال ہوا اور لوگوں نے ان کو قبر میں رکھا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے قبر کی اینٹوں اور پتھروں کو مضبوطی سے لگایا اور اس وقت فرمایا:

”میں جانتا ہوں کہ زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ یہ خراب اور بوسیدہ ہو جائیں گی لیکن خداوند عالم اس بات کو دوست رکھتا اور پسند کرتا ہے کہ بندہ جو کام بھی انجام دے اسے مضبوطی کے ساتھ انجام دے۔“ (محارالانوار ج ۲۲ ص ۷۷)

لوگوں کی کمزوری و ناواقفیت سے غلط فائدہ نہ اٹھانا

آپ لوگوں کے ضعف و کمزوری کے موقعوں اور ان کی نادانیوں سے ہرگز کوئی استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے بر عکس ان کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور لوگوں کو ان کی لاعلمی اور ناواقفیت سے آگاہ کرتے تھے۔ جس روز آپ کے ۱۵ مینیے کے فرزند جناب ابراہیم کا انتقال ہوا اسی دن اتفاق سے سورج کو گہر ہن لگا لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس گروہ کا سبب وہ مصیبت ہے جو رسول اکرم پر پڑی ہے۔ لوگوں کے اس جاہل انخیال کے روکیل میں آپ خاموش نہیں رہے بلکہ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

ایہا الناس ”اے لوگو! چاند اور سورج خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں یہ کسی کے مرنے سے غمناک نہیں ہوتیں۔“

کے منصوبوں پر بے چون و چرا معمل کرتے تھے مثلاً آپ حکم دیتے کہ تیار ہو جاؤ کل ہم چلیں گے تو سب کے سب جس طرف آپ جانے کا حکم دیتے روانہ ہو جاتے تھے اور یہ معلوم نہیں کرتے تھے کہ کہاں جانا ہے اور کس غرض سے جانا ہے؟ سفر کے آخری لمحات اور منزلوں میں انہیں معلوم ہوتا کہ آخری منزل کون سی ہے اور مقصد کیا ہے؟ کبھی چند افراد کو حق کا حکم دیتے اور اس گروہ کے سردار کو ایک مہربند خط عنایت فرماتے اور حکم دیتے کہ جب تم اتنے دن کے بعد فلاں منزل و مقام پر پہنچنا تو خط کو کھولنا اور اس کے مطابق حکم کو نافذ کرنا۔

وہ لوگ ایسا ہی کرتے تھے اور اس معینہ منزل و مقام پر پہنچنے سے پہلے انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ان کی آخری منزل کہاں ہے اور وہ کس ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے جا رہے ہیں اس حکمت عملی سے دشمن کے جا سوس آخری وقت تک بے خبری میں رہتے اور کبھی کبھی غفلت کی حالت میں انہیں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

تتقید سننے کی طاقت اور مذاہی و چاپلوسی سے نفرت

کبھی کبھی رسول اکرم اپنے بعض اصحاب کے اعتراضات کا بھی سامنا کرتے تھے لیکن آپ اظہار ناراضگی اور برہمی کے بغیر ان کی رائے کو اپنے منصوبے کے ساتھ ملا کر انہیں اپنا ہم خیال بنالیا کرتے تھے آپ خوشنام تعریف اور چاپلوسی سے بے راز تھے اور فرماتے تھے:

”خوشنامی اور چاپلوسوں کے منه پر خاک ڈالو۔“ (محارالانوار ج ۳ ص ۲۹۲)

ہر کام میں احتیاط کرنے اور کاموں میں استحکام و پائیداری کا خیال رکھنے کو پسند فرماتے تھے آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ جو کام بھی انجام پائے وہ محکم و مضبوط ہو

جماعت صدقات و ٹیکسوس کا حساب کتاب لکھتی تھی کچھ لوگ عہدنا موسوں اور اقرار ناموں کے ذمہ دار تھے: ”تاریخ یعقوبی“، ”التنبیہ والاشراف“ مسعودی ”مجم البدان“ بلازرنی اور ”طبقات“ ابن سعد وغیرہ جیسی تاریخ کی کتابوں میں یہ ساری باتیں موجود ہیں۔

تبیغ کا طریقہ کار

اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں آپ آسانی اور نرمی کا راستہ اختیار کرنے والے تھے نہ کہ سخت گیر خوف دلانے والے۔ آپ ڈرانے دھمکانے کی بجائے زیادہ تر بشارت و خوشخبری کے ذریعے دعوت دیتے تھے۔ اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو تبلیغ اسلام کی غرض سے یمن بھیجا تو انہیں حکم دیا کہ

یسر و لا تعر و بش رو لا تنفر (دلائل النبوة ج ۵ ص ۲۰۱)

”یعنی آسانی اور نرمی کا راستہ اختیار کرو سختی کا نہیں اور لوگوں کو خوشخبری دو اور ان کی خواہش و رغبت و شوق کو ابھارو انہیں متفرغہ کرو۔“

خود آپ تبلیغ کے کام میں اکثر مشغول رہتے چنانچہ طائف کا سفر کیا ج کے زمانے میں (باہر سے آئے ہوئے) قبائل کے درمیان تشریف لے جاتے اور تبلیغ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کو اور پھر دوبارہ معاذ بن جبل کو لوگوں کی تبلیغ کے واسطے یمن بھیجا مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے مصعب بن عمير کو مدینہ والوں میں تبلیغ کرنے کے لئے بھیجا۔ اپنے بہت سے اصحاب کو جب شہ بھیجا جنہوں نے مکہ والوں کے ظلم و ستم اور ان کی ایذ ارسانیوں سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جب شہ میں دین کی تبلیغ بھی کی اور جب شہ کے بادشاہ نجاشی سمیت وہاں کی تقریباً آدمی آبادی کے لئے اسلام لانے کا موقع فراہم کیا۔ چھٹی ہجری میں دنیا کے بادشاہوں کو خطوط روانہ فرمائے جن میں انہیں اپنی نبوت و رسالت کی خبر دی ان میں سے تقریباً ایک سو خطوط کی نقلیں

رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی شخصیت قیادت و رہبری کی شرائط کی بہترین مصدق

قیادت و رہبری کی شرائط کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے تشخیص و تمیز کی حس دلیری اور ہوشیاری کامل یقین پیش کریں قدی کرنا محتمل و ممکن عاقب سے بے خوف رہنا مستقبل بینی اور دوراندیشی تلقید برداشت کرنے کی قوت افراد شناسی افراد کی قتوں کا اندازہ کرنا اور ان کے مطابق انہیں اختیارات سونپنا۔ نجی اور انفرادی امور میں نرمی اصولی مسائل میں سختی اپنے پیروکاروں کی شخصیت کو اجاگر کرنا اور ان کی طرف برابر متوجہ رہنا ان کی عقلی جذباتی اور عملی صلاحیتوں کی تربیت کرنا اور انہیں ابھارنا استبداد و حاکمیت اور اندھی تلقید کے میلان و رجحان سے پرہیز تو اسحاق و انکساری سادگی و درویشی وقار و ممتازت و سنجیدگی تنظیم اور نظام کو دوست رکھنا تاکہ انسانی قتوں کو استعمال میں لایا جاسکے اور انہیں منظم کیا جاسکے۔ یہ تمام شرائط و صفات رسول اکرم کی ذات اقدس میں کمال کی حد تک اور مکمل طور پر موجود تھیں۔

آنحضرت فرماتے تھے:

”اگر تم میں آدمی ایک ساتھ سفر کرتے ہو تو اپنے میں ایک آدمی کو رکھیں و حاکم منتخب کر لیا کرو۔“

آپ نے مدینہ کے اندر خود اپنے معاشرے میں خاص شعبے قائم کئے تھے مثلاً مشیوں کی تربیت فرمائی تھی ہر گروہ کو الگ الگ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ چند کتابان وہی کی حیثیت سے تھے جو قرآن کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک گروہ خصوصی خط و کتابت کے لئے مخصوص تھا۔ کچھ لوگوں کے معاہدوں اور معاملات کو لکھا کرتے تھے۔ ایک

اکا اخلاق اور آپ کے خصائیں آپ کے کلام اور آپ کے دین کی مانند جامعیت اور ہمہ گیر حیثیت کے حامل تھے۔ تاریخ آپ کی مانند کسی ایسی شخصیت کو پیش کرنے سے قاصر ہی ہے اور نہ ہرگز کسی ایسی شخصیت کو پیش کر سکتی ہے کہ جو تمام انسانی پہلوؤں کے اعتبار سے حد کمال کو پہنچی ہو آنحضرت واقعاً انسان کامل تھے۔



اہمی بھی موجود ہیں جو آپ نے مختلف اشخاص کو تحریر فرمائے تھے۔

علم کی تشویق و ترغیب

آپ لوگوں کو تحصیل علم کا شوق دلاتے تھے آپ نے اپنے اصحاب کے پیغمبر کو آمادہ کیا کہ وہ علم حاصل کریں۔ اپنے کئی اصحاب کو حکم دیا کہ وہ سریانی زبان سیکھیں۔

آپ فرماتے تھے کہ

”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض اور واجب ہے۔“

(بخار الانوار ج ۱ ص ۷۷)

ایک اور مقام پر آپ فرماتے ہیں:

”حکمت کو جہاں اور جس شخص کے پاس پاؤ اگر وہ مشرک اور منافق ہی کیوں نہ ہو اس کو حاصل کرو۔“ (بخار الانوار ج ۲ ص ۹۹)

نیز آپ فرمایا کرتے تھے:

”علم کو تلاش کرو اگرچہ تم کو اس کے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔“ (بخار الانوار ج ۱ ص ۷۷)

طلب و تحصیل علم کے لئے آنحضرت کی یہ تاکید و ترغیب اس بات کا باعث بنی کہ مسلمان ہمت و حوصلے اور بے مثال تیزی کے ساتھ پوری دنیا میں علم کی جگتو اور اس کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ جہاں جہاں علمی آثار پائے انہیں حاصل کیا۔ ان کے ترجمے کئے اور خود تحقیق میں مصروف ہو گئے اور اس طریقے سے یونانی رومنی ایرانی مصری اور ہندی جیسے قدیم تمدنوں کے درمیان باہمی رابطے کا حلقة بننے کے ساتھ خود تاریخ بشریت میں شاندار اور باوقار تمدن کی بنیاد رکھ دی جس کو ”اسلامی تمدن و ثقافت“ کے نام سے پہچانا گیا اور اب بھی پہچانا جاتا ہے۔ آپ